تاخیر پسند
طاہر جاوید مغل

محبوب احمد کو ٹھیک سے یاد نہیں تھا کہ اس نے سارہ کو سب سے پہلے کہاں دیکھا تھا۔ شاید وہ اپنے گھر کے صحن سے برآمدے کی طرف جا رہی تھی۔ شاید وہ چھت پر کپڑے پھیلا رہی تھی۔ شاید وہ ٹیوشن سے پڑھ کر واپس آ رہی تھی۔ محبوب کو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اسے پہلے سارہ کی شکل سے پیار ہوا تھا یا اس کی آواز سے۔ اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ بس یہ معلوم تھا کہ وہ ایکا ایکی اس گڑیا سی نازک اندام لڑکی سے پیار کرنے لگا ہے۔ وہ بہت زیادہ خوب صورت تو نہیں تھی مگر اس کے نقوش میں زبردست موزونیت اور تناسب تھا۔ محبوب کو اس کے سراپا میں سب سے دلکش چیز اس کی پیشانی لگی تھی۔ بے حد باوقار اور خوب صورت پیشانی۔ جب وہ ہنستی تھی یا کسی بات پر بہت غور کرتی تھی تو اس پیشانی پر ایک رگ سی ابھر آتی تھی۔ محبوب احمد کا جی چاہتا تھا وہ اس رگ اور پیشانی کو دیکھتا چلا جائے۔ اپنے اردگرد کی ہر شے کو فراموش کر دے۔ حتیٰ کہ گزرے ہوئے وقت کو بھی.......... لیکن عملی طور پر ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ سارہ سے محبوب کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ دونوں صرف پڑوسی تھے اور پڑوسی بھی عارضی........... مستقل گھر اسی آبادی کی ایک دوسری گلی میں واقع تھا۔ سن 58ء میں جب محبوب کے والد سیالکوٹ سے لاہور آئے تھے تو انہیں اس متوسط بستی میں آٹھ دس مرلے جگہ اونے پونے داموں مل گئی تھی۔ یہاں دو تین کمرے پہلے سے تعمیر شدہ تھے۔ بارہ چودہ برس محبوب کے والدین نے انہی کمروں میں گزارہ کیا تھا لیکن اب چونکہ محبوب کے والد کا عینک سازی کا کام چل نکلا تھا اور مالی حالت بہتر ہو گئی تھی لہٰذا انہوں نے پرانی طرز کے کمرے گرا کر دو منزلہ مکان بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ محبوب کے والد وقار صاحب کا اندازہ تھا کہ مکان مکمل ہونے میں قریباً چار پانچ ماہ لگ جائیں گے۔ تعمیر ہوتے ہوئے مکان میں رہنے سے کہیں بہتر تھا کہ وہ چند ماہ کے لئے علیحدہ سے کرائے کا مکان لے لیں۔ یہ مکان ڈھونڈنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی اور نومبر کی ایک سہانی صبح وہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اس کرائے کے مکان میں اٹھ آئے تھے۔ یہی مکان جس کے سامنے سارہ کا مکان تھا، اور جہاں

زندگی کو ایک نئی راہ پر ڈالنے والے منہ زور واقعات محبوب کا انتظار کر رہے تھے۔

محبوب نے زندگی کی اٹھارہ بہاریں دیکھی تھیں۔ ہاں.......... وہی عمر۔ جب آنکھوں میں نشہ تیرتا ہے' جب سانسوں سے خوشبو پھوٹتی ہے' جب چال میں رقص کی سی کیفیت ہوتی ہے اور جب اپنی ہی اداؤں پر پیار آنے لگتا ہے۔

.... محبوب اٹھارہ سال کا تھا اور اس سن سے وابستہ ساری کیفیات اس پر بھی طاری ہوتی تھیں لیکن وہ اپنی کیفیات کا اظہار بہت کم کر پاتا تھا۔ ایک تو وہ فطرتاً کم گو اور اندرون بین تھا' دوسرے والدین کی طرف سے اس پر پابندیاں بھی بہت تھیں۔ خاص طور سے والد "سونے کے لقمے اور شیر کی آنکھ" والے محاورے کے قائل تھے۔ محبوب ان دنوں فرسٹ ایئر میں تھا۔ گورنمنٹ کالج میں نظم و ضبط عام کالجوں سے کہیں زیادہ تھا۔ عموماً وہ ڈیڑھ دو بجے فارغ ہو کر گھر آتا تھا۔ کھانا وغیرہ کھا کر ذرا لیٹتا تھا تو سردیوں کی شام جھپٹ کر سر پر آن پہنچتی تھی۔ شام ہوتے ہی والد صاحب کے دوست پروفیسر ریاض صدیقی' محبوب اور اس کے چھوٹے بھائی عاطف کو پڑھانے آجاتے تھے۔ ریاض صدیقی صاحب جاتے تھے کہ والد صاحب تشریف لے آتے تھے۔ والد صاحب کے آنے کے بعد ممکن ہی نہیں ہوتا تھا کہ محبوب یا عاطف کہیں جاسکتے یا کسی تفریحی یا نیم تفریحی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتے۔ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد جلدی بستر پر جانے کا حکم تھا اور اس حکم کی تعمیل اکثر انہیں کرنا پڑتی تھی۔

اتوار کا دن محبوب کے لئے قدرے فراغت اور مسرت کا دن ہوتا تھا۔ وہ دیر تک سوتا' چھت پر دھوپ سینکتا' کبھی اپنے لنگوٹیے دوست قدیر کے ساتھ اسکوٹر پر آؤٹنگ کے لئے نکل جاتا۔ کبھی کبھار چپکے چپکے فلم دیکھنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ وہ بھی اتوار کا ایک ایسا ہی سہانا اور چمکیلا دن تھا جب اپنے بالائی کمرے کی کھڑکی سے محبوب نے بڑے غور سے سارہ کو دیکھا تھا اور فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس کے قریب جانے کی کوشش کرے گا اس فیصلے کے بعد اس کے ذہن میں وہی خیال آیا جو اس عمر میں نوجوانوں کے ذہن میں اکثر آتا ہے۔ وہ اپنے دلی جذبات فریقِ ثانی تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ کسی خوب صورت شعر' کسی خوب صورت بات' یا اشارے کنائے کی شکل میں۔ بعض اوقات خط اور فون وغیرہ کا سہارا بھی لیا جاتا ہے۔ فون تو ان دنوں اتنا عام نہیں تھا اور متوسط طبقے میں تو بالکل ہی نہیں تھا۔ اظہارِ جذبات کا بہترین ذریعہ خط ہی ہو سکتا تھا۔ اتوار کی بہت ساری سنہری

دھوپ اور تازہ ہوا کا خسارہ برداشت کر کے' محبوب ایک کمرے میں بند ہو گیا اور اس نے کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ سارہ کے نام ایک طویل خط لکھ دیا۔

اس محبت نامے میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہی تحریر تھی جو ہمیشہ سے لکھی جاتی رہی ہے اور پڑھی جا رہی ہے لیکن یہ جب بھی لکھی جاتی ہے اس میں ایک نیا پن' ایک دلفریب تازگی خود بخود در آتی ہے.......... محبوب نے بڑے سلجھے ہوئے الفاظ بڑی احتیاط کے ساتھ استعمال کئے تھے۔ اپنی عقل سمجھ کے مطابق پوری کوشش کی تھی کہ کہیں کوئی عامیانہ پن نہ آجائے۔ کوئی ایسا فقرہ جو "سارہ" کو برا لگے۔ خط مکمل کرنے اور اسے کئی بار پڑھنے کے باوجود اسے دس فیصد یقین بھی نہیں تھا کہ وہ یہ خط سارہ تک پہنچا سکے گا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ شاید یہ خط اس نے صرف اپنے لئے لکھا ہے۔ جیسے کچھ مصور اور شاعر اپنی تصویریں اور نظمیں صرف اپنی تسکین کے لئے تخلیق کرتے ہیں۔ خود ہی دیکھتے ہیں اور لطف اٹھاتے ہیں.......... اس خط کو منزل تک پہنچانا محبوب کو اتنا دشوار نظر آ رہا تھا جتنا کسی کے لئے بیساکھیوں کی مدد سے ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنا' مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر وہ اپنا اور سارہ کا درمیانی فاصلہ کم کرنا چاہتا ہے تو اسے یہ خط کسی بھی صورت سارہ تک پہنچانا ہو گا۔

اس نے یہ خط ایک موہوم امید کے سہارے سنبھال لیا۔ موہوم امید یہ تھی کہ شاید جو ہمت اسے درکار ہے وہ آج نہیں تو کل پیدا ہو جائے۔ اس کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا تھا۔ وہ کوئی کام کرنا چاہتا تھا لیکن نہیں کر پاتا تھا مگر وہ قطرہ قطرہ حوصلہ جمع کرتا رہتا تھا۔ خود کو ذہنی طور پر آمادہ کرتا رہتا تھا اور آخر ایک مرحلہ آتا تھا کہ وہ یہ کام کر گزرتا تھا۔ بے شک ایسا کرتے ہوئے اسے تاخیر ہو جاتی تھی اور بعض اوقات وہ "کام" انجام پا کر بھی "بے انجام" ہی رہتا تھا لیکن اس مسئلے کا محبوب کے پاس کوئی حل نہیں تھا۔ شاید تاخیر اس کی فطرت میں شامل تھی۔ جلدی کی خواہش کے باوجود ہر کام میں دیر کر جانا اور پھر مہینوں اور سالوں اپنی ناکامی پر کڑھنا محبوب کی تقدیر تھا۔ سارہ سے اظہارِ محبت میں بھی محبوب نے بے وجہ تاخیر کی اور اس تاخیر کے سبب حسین و دلکش پیشانی والی سارہ اس سے دور چلی گئی۔

خط لکھنے کے بعد محبوب نے اپنی چرمی فائل کے اندرونی خانے میں رکھ دیا تھا۔ وہ قریباً ہر روز اس خط کے بارے میں سوچتا اور یہ غور کرتا کہ اس خط کو سارہ تک کیسے پہنچایا

جا سکتا ہے۔ یہ سوچ اس کی پیشانی پر پسینہ لے آتی اور اسے اپنی سانس بڑی تیزی سے چلتی محسوس ہوتی۔ ایک دو بار تو اس کے جی میں آئی کہ وہ خط پھاڑ ہی دے لیکن پھر کسی انجانی امید کے سہارے وہ اس کارروائی سے باز رہا.......... اس نے یہ محبت نامہ اپنے کالج کے ایک دوست پاشا کو بھی دکھایا۔ پاشا نے کہا۔

"یار! تم تو چھپے رستم نکلے۔ ایسا خط تو پکے سے پکا عاشق بھی نہیں لکھ سکتا۔ سچ بتاؤ اس سے پہلے کہاں کہاں ٹرائی ماری ہے۔"

محبوب نے کہا "اُلو کے! ایسی بات ہوتی تو تجھے ضرور بتاتا۔ خدا قسم اس سے پہلے کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔"

"اور وہ جو بابرہ شریف کے عشق میں گرفتار رہا ہے تو؟"

"ویسے عشق تو تُو نے بھی درجن بھر کئے ہوں گے۔ خیالی عشق اور اصلی والے عشق میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"بس یہی فرق ہوتا ہے کہ اصلی عشق میں اصلی جوتے پڑتے ہیں۔ ذرا سنبھل کے یار! یہ بڑا مشکل رستہ ہے۔ بڑوں بڑوں کا ڈبا گول ہو جاتا ہے۔"

پھر ایک دن محبوب پر جیسے قیامت گزر گئی۔ اس نے الماری میں اپنی کتابیں ترتیب سے رکھتے ہوئے چرمی فائل دیکھی اور بھونچکا رہ گیا۔ خط' فائل میں موجود نہیں تھا۔ اس نے جلدی جلدی ساری فائل کھنگالی۔ ایک ایک کتاب اور کاپی دیکھ ڈالی لیکن خط نہیں ملا۔ سردی کے باوجود پسینہ اس کے چہرے پر دھاروں کی صورت بہنے لگا۔ "یاالٰہی یہ کیا ہو گیا۔ کہاں گیا وہ خط۔ کس کے ہاتھ لگا؟" والد' والدہ' باجی' عاطف سب کی صورتیں ایک ایک کرکے اس کی نگاہوں میں گھومیں اور وہ عرق ندامت میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ منہ چھپا کر گھر سے نکلے اور کسی ویرانے میں جا کر بھٹک جائے۔ اس روز سارا دن وہ سہمے سہمے انداز میں اہلِ خانہ کی صورتیں تکتا رہا اور اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ اس کا "راز" کس کے ہاتھ لگا ہے۔ بظاہر سب کچھ نارمل تھا۔ والدہ حسبِ معمول خوشگوار موڈ میں تھیں۔ باجی کے چہرے پر بھی خفگی نظر نہیں آئی۔ عاطف کی آنکھوں میں شرارت تو ہر وقت رہتی تھی لیکن کوئی خصوصی کیفیت وہاں بھی نظر نہیں آئی۔ رہی والد صاحب کی بات تو محبوب کو تسلی تھی کہ خط ان کے ہاتھ نہیں لگا۔ کیونکہ ان کے ہاتھ لگتا تو پھر اب تک محبوب کے لئے زمین و آسمان ایک ہو چکے ہوتے۔ وہ "اچھے کام" میں دیر کرنے کے

قائل ہرگز نہیں تھے اور اس سے اچھا کام اور کیا ہو سکتا تھا کہ پڑوس کی لڑکی کو محبت نامہ لکھنے کی پاداش میں محبوب کو کمرے میں بند کیا جاتا اور اس پر اتنا گرجا برسا جاتا کہ کئی مہینے کے لئے اس کی طبیعت صاف ہو جاتی۔ ابھی تک ایسا کچھ نہیں ہوا تھا' لہٰذا یہ بات سو فیصد یقینی تھی کہ وہ "مہلک خط" ابا حضور کے ہاتھ نہیں لگا۔ محبوب کے والد ایک مقامی کالج میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر پڑھاتے تھے۔ عینک سازی کا کام انہوں نے پارٹ ٹائم کے طور پر شروع کیا تھا جو کافی پھلا پھولا تھا۔

سارہ کے سلسلے میں محبوب کے تمام نرم گرم جذبات پر اوس پڑ گئی تھی اور وہ جو سر تا پا شعلہ بنا ہوا تھا' یک دم قلفی کی طرح ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ محبوب کا تعلق مذہبی گھرانے سے تھا۔ سب صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اور شریف النفسی کی وجہ سے انہیں گلی محلے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ محلے کی بچیاں محبوب کی والدہ کے پاس قرآن شریف پڑھنے آجاتی تھیں اور وہ بھی بڑی لگن اور محبت کے ساتھ گھنٹوں ان کو پڑھانے میں مصروف رہتی تھیں۔ گھر میں دو نوجوان لڑکے بھی تھے۔ اس کے باوجود لوگ اپنی نو عمر اور نوجوان لڑکیوں کو بلا جھجک ان کے ہاں بھیج دیتے تھے۔ بعض اوقات یہ لڑکیاں سارا دن ان کے ہاں رہتی تھیں یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اہل محلہ اس گھرانے کی شرافت پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے۔ محبوب اس صورت حال سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے اپنی غلطی پر ضرورت سے زیادہ پشیمانی ہو رہی تھی۔ خط گم ہونے کے بعد پانچ چھ ہفتوں تک اسے سارہ کا خیال تک نہیں آیا۔ ہر گھڑی دل کو یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ پتا نہیں کب گمشدہ خط کا سویا ہوا آتش فشاں ایک دم پھٹ پڑے اور ہر طرف دہکتا ہوا سرخ سرخ لاوا پھیلنے لگے۔ سوتے جاگتے "خط" اس کے تصور میں رہتا اور الفاظ شرم انگیز انداز میں اس کی آنکھوں کے سامنے ناچتے رہتے۔ اہلِ خانہ میں سے کوئی اسے آواز دیتا تو لگتا کہ "خط" پر بات شروع ہونے لگی ہے۔ بیرونی دروازے پر دستک ہوتی تو وہ سوچتا کہ یہ دستک خط کے سلسلے میں ہے۔ گھر میں یا گلی محلے میں کوئی دو افراد رازداری سے بات کرتے نظر آتے تو محبوب کو یوں لگتا کہ وہ اس کے خط کے سلسلے میں بات کر رہے ہیں۔ عجیب سے واہموں میں گھر گیا تھا وہ.......... کبھی کبھی یہ سوچ کر اسے تسلی ہوتی کہ اتنے روز گزرنے کے باوجود ابھی تک اس کے سر پر آسمان ٹوٹ کر نہیں گرا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ خط گھر میں یا کالج میں گم نہیں ہوا بلکہ راستے میں آتے جاتے کہیں فائل میں

سے گر گیا ہے۔

محبوب' قدیر سے ملنے اکثر اس کے گھر چلا جاتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ قدیر اس کا لنگوٹیا یار تھا اور دونوں دن میں کم از کم ایک بار ضرور ملتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ قدیر اور سارہ ایک ہی چار دیواری میں رہتے تھے۔ وہ قدیر سے ملنے جاتا تھا تو سارہ کی ایک آدھ جھلک بھی نظر آجاتی تھی۔ دراصل قدیر اور اس کے گھر والے' سارہ کے مکان میں کرائے دار کی حیثیت سے رہتے تھے۔ یہ ایک کافی کھلی جگہ تھی لیکن تعمیر تھوڑے حصے میں کی گئی تھی باقی احاطہ کھلا پڑا تھا۔ اس احاطے میں ایک جانب ایک درمیانے سائز کا کمرا اور ایک نیم پختہ کوٹھا سا تھا۔ یہ پورشن سارہ کے والد رزاق صاحب نے کرائے پر اٹھایا ہوا تھا۔ قدیر اپنی والدہ اور دو چچازاد بھائیوں کے ساتھ اسی پورشن میں رہتا تھا۔ کبھی کبھی جب محبوب کے والد کام کے سلسلے میں شہر سے باہر ہوتے تھے' قدیر اور اس کے چچازاد بھائیوں کے ساتھ محبوب کی خوب محفلیں جمتی تھیں۔ ان محفلوں کا ٹھکانا وہی نیم پختہ کوٹھا ہوتا تھا لیکن جب سے محبوب کا محبت نامہ گم ہوا تھا اور سارہ کی طرف سے اس کا دھیان ہٹا تھا وہ قدیر سے ملنے بھی کم ہی جاتا تھا۔ قدیر اکثر اس بات پر شاکی رہتا تھا اور ایک دو بار ناراض بھی ہوا تھا۔ ایک دن محبوب' قدیر سے ملنے اس کے گھر گیا تو وہ نیم پختہ کوٹھے میں چارپائی پر نیم دراز تھا۔ اس نے اپنی کمر کے نیچے تین چار تہہ شدہ لحاف رکھے ہوئے تھے اور ٹانگیں بڑے اسٹائل سے اٹھا کر کوٹھے کی دیوار سے ٹکائی ہوئی تھیں۔

محبوب نے کہا۔ "کیا بات ہے قدیری! آج بڑے موڈ میں نظر آتا ہے۔"

قدیر نے لہک کر کہا۔ "شہزادے! اس کو کہتے ہیں سونے پر سہاگا۔ یعنی ایک تو میں پہلے ہی خوش تھا' بلکہ خوشی سے پھٹا پڑ رہا تھا' اوپر سے تو بھی آگیا ہے۔"

"کیوں' کیا کوئی بانڈ شانڈ نکل آیا ہے تیری امی کا؟"

"امی کا تو نہیں نکلا لیکن میرا ضرور نکل آیا ہے۔ بلکہ بانڈ بھی کیا لاٹری نکلی ہے' ایسی لاٹری کہ بس کیا بتاؤں۔"

"لاٹری.........؟ کیا مطلب؟"

قدیر نے محبوب کی گردن میں بازو ڈالا اور کھینچ کر اسے اپنے قریب بٹھالیا۔ پھر اس کی گردن کو مزید خم دے کر اپنے سینے کے پاس لے آیا۔ اب محبوب کے چہرے کے بالکل

سامنے وہ چھوٹی سی کھڑکی تھی جس میں سے سارہ کے گھر کا بیرونی دروازہ اور ایک کمرے کی کھڑکی صاف نظر آرہی تھی۔

قدیر نے دبے دبے جوش میں کہا۔ "وہ دیکھ میرے گھامڑ شہزادے! وہ رہی لاٹری۔"

محبوب نے غور سے دیکھا۔ کمرے کی کھڑکی میں جالی لگی ہوئی تھی۔ جالی کے بالکل ساتھ اسے گلابی قمیض کی جھلک نظر آئی۔ غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ سارہ کھڑکی میں بیٹھی ہے۔ اس کا سر ایک کتاب پر جھکا ہوا تھا۔ اپنے چہرے پر ڈھلک آنے والی ریشمی لٹوں کو وہ گاہے گاہے پنسل سے پیچھے ہٹا دیتی تھی۔

محبوب کا دل یکبارگی زور سے اچھلا پھر جیسے ساکت سا ہو گیا۔ ایک ٹھنڈی لہر اس کے پورے جسم میں پھیل گئی۔ قدیر کی آواز جیسے اس کے کانوں میں کہیں دور سے آرہی تھی۔ "بس شہزادے! بڑی زوردار چیز ہے۔ پہلے تو لگتا تھا کہ بالکل گھاس ہی نہیں ڈالے گی لیکن اب معاملہ ٹھیک ہوتا نظر آرہا ہے' کبھی کبھی دیکھ کر ہنستی ہے۔ کل تو یہاں کوٹھے میں بھی آگئی تھی۔ اپنے ہاتھ سے حلوا پکا کر لائی تھی۔ میں نے ایک شعر سنایا' شرما کر بھاگ گئی۔"

قدیر اس روز دیر تک سارہ کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اگلے روز ملاقات ہوئی تو اس نے پھر سارہ کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ شروع میں تو محبوب کو اس کی باتیں بڑی بری لگیں۔ بالکل جیسے کوئی کڑوی کسیلی چیز زبردستی حلق میں ٹھونسی جا رہی ہو' لیکن پھر دھیرے دھیرے اس نے اپنے دل کو سمجھا لیا۔ بہت سے دوسرے کاموں کی طرح سارہ کے سلسلے میں بھی اس نے دیر کر دی تھی۔ خیر' اب کیا ہو سکتا تھا۔ یہی شکر تھا کہ ابھی وہ سارہ کے معاملے میں بہت زیادہ سنجیدہ نہیں ہوا تھا ورنہ قدیر کے انکشافات سے اسے زبردست ٹھیس پہنچتی۔ وہ کوشش کر کے قدیر کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا اور حسبِ دانش اسے چھوٹے بڑے مشوروں سے بھی نوازنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے قدیر کی کامیابی اور اس کی کامیابی ایک ہی چیز ہے اور اگر کل کلاں قدیر' سارہ کے قریب جانے میں کامیاب ہوتا ہے تو جتنی خوشی قدیر کو ہو گی اتنی ہی خود اسے بھی ہو گی۔

قدیر صرف پانچ جماعتیں پاس تھا۔ لکھنا تو دور کی بات ہے' ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں سکتا تھا لیکن اس کی ذہانت اور ہنرمندی میں کسی طرح کا شک نہیں تھا۔ وہ درزیوں کا کام کرتا تھا۔ اس کے علاوہ لکڑی کا کام بھی جانتا تھا۔ صرف دو تین سال پہلے وہ ایک مشہور

استاد کا شاگرد بنا تھا اور اب استاد سے بھی دو تین ہاتھ آگے نظر آتا تھا۔ کم عمری میں ہی اس کی آمدن ڈیڑھ دو ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ قدیر کا بڑا بھائی بھی درزی کا کام کرتا تھا لیکن اس میں قدیر جیسی ہنرمندی نہیں تھی۔ قدیر کے والد کئی سال پہلے فوت ہو چکے تھے اور والدہ بھی گھر ہی میں سلائی کڑھائی کا کام کرتی تھیں۔

تین چار روز بعد قدیر محبوب کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "شہزادے! آج ایک خط تو لکھ دے، سارہ کے لئے۔"

معمولی تذبذب کے بعد محبوب تیار ہو گیا۔ دونوں چھت پر چلے گئے اور برساتی میں بیٹھ کر خط لکھنے لگے۔ یہ قدیر کا پہلا خط تھا۔ محبوب نے بڑی احتیاط اور سمجھ بُوجھ کے ساتھ قدیر کے تند و تیز جذبات الفاظ کی صورت میں ڈھال دیئے۔ خط سن کر قدیر اش اش کر اٹھا۔ اس نے بے اختیار محبوب کا رخسار چوما اور خط تعویذ کی طرح تہہ کرنے کے بعد شلوار کے کھیسے میں اڑس لیا۔

قدیر کے جانے کے بعد محبوب کچھ دیر اپنی جگہ گم صم بیٹھا رہا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے خط لکھتے لکھتے اس کے دل پر چھوٹا سا چرکا لگ گیا ہے۔ شاید اسے وہ خط یاد آگیا تھا جو اس نے چند ہفتے پہلے اپنی طرف سے سارہ کو لکھا تھا۔ بہرحال بہت جلد اس نے متاسفانہ خیالات اپنے ذہن سے جھٹک دیئے اور قدیر کی خوشی میں اپنی خوشی کو شامل کر دیا۔

سارہ سے قدیر کا افیئر چل رہا تھا۔ اسے خط بھی قدیر نے لکھا تھا......... اور پہنچایا بھی قدیر نے تھا لیکن قدیر سے زیادہ جواب کا انتظار شاید محبوب کو تھا۔ وہ بے چینی سے اگلے دن کا انتظار کرتا رہا تھا۔ علی الصباح قدیر ان کے گھر آیا تھا۔ والد گھر میں موجود تھے۔ محبوب نے اشاروں کنایوں میں قدیر سے پوچھا تھا کہ جواب آیا؟

قدیر نے اشارے سے ہی بتایا کہ ابھی نہیں آیا لیکن امید ہے کہ ضرور آئے گا۔
اس روز کالج میں بھی محبوب سارہ اور قدیر کے بارے میں ہی سوچتا رہا تھا۔ سہ پہر کو وہ گھر آیا۔ سب سے پہلے اس نے والدہ سے یہی پوچھا کہ قدیر تو نہیں آیا تھا؟ والدہ کا جواب نفی میں تھا۔ قدیر کی اس روز کام سے چھٹی تھی لیکن وہ گھر پر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ محبوب رات تک بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ اسے یہ خوف محسوس ہونے لگا کہ کہیں خط کی وجہ سے کوئی گڑبڑ نہ ہو گئی ہو اور قدیر جو گھر میں نظر نہیں آ رہا تو اس کے پیچھے کوئی

سنگین وجہ نہ ہو۔ اسی اُدھیڑبن کا شکار وہ چھت پر چلا گیا۔ اس نے تین چار بلیاں پال رکھی تھیں۔ اپنے گھر میں تو ان بلیوں کے لئے زبردست انتظامات تھے لیکن اس عارضی رہائش گاہ پر بلیاں بھی جیسے تیسے گزارہ کر رہی تھیں۔ ان کا "دڑبا" چھت پر رکھ دیا گیا تھا اور محبوب اکثر ان کی طرف توجہ نہیں دے پاتا تھا۔ وہ بلیوں والے دڑبے کے قریب کھڑا تھا جب اچانک اسے قدیر نظر آیا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر درج تھا کہ اس کی مراد پوری ہو گئی ہے۔ اس کے چہرے کی چمک دیکھ کر محبوب بھی کھل اٹھا۔ قدیر نے محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ کر قمیض اوپر اٹھائی اور نیفے میں اڑسا ہوا خط نکال کر محبوب کو تھما دیا۔

دونوں کے ہاتھ مسرت سے کانپ رہے تھے۔ برساتی میں گھس کر انہوں نے خط پڑھا۔ سارہ نے مناسب الفاظ میں خط کا جواب دیا تھا۔ اس خط میں "ٹین ایجرز" کی مخصوص شوخی اور تیزی طراری نظر آتی تھی۔ ایک دو شعر بھی لکھے تھے۔ آخر میں قدیر سے پوچھا گیا تھا کہ اس نے یہ خط کس سے لکھوایا ہے۔

اسی وقت قدیر نے محبوب سے خط کا جواب لکھوایا۔ اس میں قدیر نے اپنے دل کا حال لکھوا دیا اور سارہ سے درخواست کی کہ وہ اسے کہیں اکیلے میں ملے۔ اس نے سارہ کو اپنی بے پناہ محبت اور وارفتگی کا یقین دلایا۔ اس کی درخواست پر محبوب نے حسبِ حال دو تین شعر بھی لکھ دیئے۔ قدیر کے کہنے پر محبوب نے سارہ کو مطلع کر دیا کہ یہ خط کس سے لکھوایا گیا ہے۔ اس کے بعد تواتر سے خطوط آنے اور جانے لگے۔ سارہ کے کسی کسی خط میں محبوب کا ذکر بھی ہوتا تھا۔ وہ محبوب کو محبوب بھاہی جان کہہ کر مخاطب کرتی تھی اور اس کا حال چال پوچھتی تھی۔ بھائی جان کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ سارہ کی ایک چھوٹی بہن پنکی محبوب کو بھاہی جان کہتی تھی۔ اس کے منہ سے یہ لفظ سب کو اتنا اچھا لگتا تھا کہ سارہ نے بھی اپنا لیا تھا۔ اب یہ عادت پختہ ہو گئی تھی اور سارہ بڑی روانی سے بھائی جان کے بجائے بھاہی جان لکھ جاتی تھی۔ قدیر اور سارہ کے اس محبت بھرے کھیل میں محبوب کو جو "حیثیت" حاصل ہوئی تھی وہ اس نے صدقِ دل سے تسلیم کر لی تھی۔ اب سارہ اس کے لئے صرف اور صرف قدیر کی محبوبہ تھی اور ان دونوں کی محبت کو پھلتے پھولتے دیکھنا محبوب کی سب سے بڑی خواہش تھی۔

رم جھم برستی بارش والی وہ شام محبوب کے لئے یادگار تھی جب قدیر جوش سے

بھرا ہوا اس کے پاس پہنچا تھا اور اس نے محبوب کو بتایا ۔ کے لئے ڈھارے (نیم پختہ کمرے) میں آئی تھی اور اس نے چوما بھی تھا۔

محبوب کے لئے کتنا سرور تھا اس خبر میں۔ وہ کئی دن اس خبر کے سحر میں گرفتار رہا تھا........... پھر قدیر اور سارہ کی محبت قدم قدم آگے بڑھنے لگی۔ ان کے خطوط طویل اور زیادہ بے تکلف ہوتے چلے گئے۔ وہ اکثر ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں گم ہونے لگے، عہد و پیمان باندھنے لگے، لیکن ان دونوں کے درمیان محبوب بھی موجود رہا۔ اس کا ذکر ان دونوں کی گفتگو میں ہوتا رہا۔ خطوں میں اس کے بارے میں لکھا اور پڑھا جاتا رہا اور کبھی کبھی وہ ان کی ملاقاتوں میں بھی موجود رہا۔ ایک ایسی ہی ملاقات محبوب کے گھر میں بھی ہوئی تھی۔ محبوب کے سب گھر والے ایک شادی میں گئے ہوئے تھے۔ قدیر کے ہوشیار ذہن نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سارہ کو آمادہ کر لیا کہ وہ سہ پہر کے وقت سہیلی سے ملنے کے بہانے گھر سے نکلے اور محبوب کے گھر سے "بیٹھک والے دروازے" سے اندر آجائے۔

تذبذب میں ہونے کے باوجود سارہ یہ سب کچھ کر گزری۔ قدیر، سارہ اور محبوب قریباً دو گھنٹے رازداری سے بیٹھک میں موجود رہے۔ سارہ آزاد خیال ضرور تھی لیکن وہ بہت ذہین اور محتاط بھی تھی۔ اس نے کبھی بھی قدیر کو ایک حد سے بڑھنے نہیں دیا۔ قدیر سے اس کی وابستگی اور محبت اپنی جگہ تھی تاہم وہ یہ بھی جانتی تھی کہ فاصلے میں محبت کی زندگی اور قربت میں موت پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی لیکن اپنی عمر اور تعلیم سے زیادہ جانتی بوجھتی تھی۔ وہ محبوب کو بڑے خلوص سے بھاہی جان کہتی تھی اور ہر معاملے میں اس کی رائے کو اہمیت دیتی تھی۔ قدیر سے بات کرتے وقت اس کا لہجہ اکثر شوخ ہو جاتا تھا مگر محبوب کے ساتھ وہ بڑی سنجیدگی اور احترام کے ساتھ بات کرتی تھی۔ غالباً اس کے ذہن میں ہر وقت یہ خیال موجود رہتا تھا کہ محبوب کا تعلق ایک نہایت دین دار اور شریف گھرانے سے ہے، اور اس حوالے سے محبوب کے ساتھ اس کا رویہ محتاط اور رکھ رکھاؤ کا ہونا چاہئے۔

گھر کی بیٹھک میں ہونے والی اس ملاقات میں محبوب کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ سارہ کو زیادہ قریب سے دیکھ سکے اور اس کی شخصیت کو سمجھ سکے۔ وہ "پیشانی" جو ہمیشہ

سے محبوب کو دلکش لگتی تھی آج بھی سارہ کے چہرے کی دلکشی میں اضافے کا سبب تھی۔ وہ شفاف اجالے جیسی پیشانی جس پر "ہنستے ہوئے" ایک خوب صورت رگ شعاع کی طرح ابھر آتی تھی۔ محبوب نے اس پیشانی کو بڑے قریب سے اور بڑی دیر تک دیکھا۔

اس رات جب عشاء کی نماز کے بعد محبوب اپنے لحاف میں گھس کر لیٹا تو اسے دیر تک نیند نہیں آئی، یہاں تک کہ محبوب کے گھر کی طرح گلی میں بھی سناٹا چھا گیا۔ گلی سے آگے سڑک بھی خاموشی اوڑھ کر اونگھنے لگی۔ سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی شب نے گرد و پیش کو اپنی آغوش میں لے کر جیسے مبہوت سا کر دیا۔ اپنے پلنگ پر کروٹیں لیتے لیتے اچانک محبوب پر انکشاف ہوا کہ وہ آج بھی سارہ سے محبت کرتا ہے۔ وہ سارہ کو چاہتا ہے، اس کے لب و رخسار، اس کی دلنشیں آنکھیں، اس کی حسین پیشانی، یہ سب کچھ آج بھی اس کے دل میں گھر کئے ہوئے ہے۔ اس کا یہ خیال خام ہے کہ سارہ اور قدیر کا معاملہ شروع ہونے سے پہلے وہ سارہ کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہوا تھا۔ اپنے خیالات کی بے باکی اور خود سری محسوس کر کے وہ ٹھٹک گیا۔ وہ ایسا کیوں سوچ رہا تھا۔ سارہ اس کے پیارے دوست قدیر کی محبوبہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ اس نے خود ان دونوں کے ملنے کے راستے ہموار کئے تھے۔ اب وہ کیوں ایک رقیب کے سے خیالات ذہن میں لا رہا تھا۔ اس نے خود کو ملامت کی اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ نہ جانے آج کیا بات ہو گئی تھی۔ اس کے ذہن میں قدیر اور سارہ کے سوا کچھ آ ہی نہیں رہا تھا۔ یہی وہ کمرا تھا جس میں آج قدیر اور سارہ کی ملاقات ہوئی تھی۔ محبوب کو لگا، اس کمرے میں ابھی تک سارہ کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ اس کی خوب صورت ہنسی ان در و دیوار میں جذب تھی اور اس کی پیشانی ایک چراغ کی طرح اس کمرے کی محراب میں جلتی رہ گئی تھی۔

اگلے روز صبح سویرے قدیر، سارہ کا ایک اور نامہ لے کر آگیا تھا۔ حسبِ معمول اس خط میں محبوب کا ذکر بھی تھا۔ شروع شروع میں محبوب کے متعلق صرف ایک آدھ سطر لکھی جاتی تھی لیکن اب خط کا قریباً ایک تہائی حصہ محبوب کے لئے وقف ہوتا تھا۔ سارہ نے لکھا تھا "محبوب بھائی جان! آپ کا بہت شکریہ کہ کل آپ میرے ساتھ موجود رہے اور آپ کے خطرناک دوست (قدیر) نے مجھے تنگ کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا، وہ ناکام کر دیا۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ جب کبھی بھی ہماری ملاقات ہو، آپ ہمارے درمیان موجود

رہیں۔ آپ کے ہوتے ہوئے میں خود کو بہت محفوظ تصور کرتی ہوں۔ ممکن ہے کہ آپ کے خطرناک دوست کو میری یہ تجویز پسند نہ آئے لیکن آپ ان کی ناراضگی کی بالکل پروا نہ کریں۔ ان کا تو کام ہی ناراض ہونا ہے............ اور ان سے یہ بھی کہہ دیں کہ انگریزی فلمیں نہ دیکھا کریں ورنہ دماغ کو ٹائیفائیڈ ہو جائے گا۔ کل جب آپ تھوڑی دیر کے لئے کمرے سے باہر چلے گئے تھے تو مجھے اس بیماری کی علامتیں نظر آئی تھیں۔"

سارہ کے تقریباً ہر خط میں اس طرح کے معنی خیز اور شوخ فقرے موجود ہوتے تھے۔ بعض اوقات یہ فقرے قدیر کے سر کے اوپر سے گزر جاتے تھے۔ محبوب اسے سمجھاتا تھا اور پھر دونوں لطف اندوز ہوتے تھے۔

خط پڑھنے کے بعد محبوب نے قدیر سے کہا۔ "یار! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ خط وغیرہ تُو کسی اور سے لکھوا لیا کر۔"

"تجھے کیا تکلیف ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یار! مجھے بڑی تکلیف ہے۔ تمہیں ابا جی کی سخت طبیعت کا تو پتا ہے۔ کسی دن انہیں بھنک پڑ گئی تو ایمان سے دو کانوں میں سر کر دیں گے۔ کل مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ قدیر تجھ سے کیا لکھوا رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا' گاؤں میں اپنی پھوپی کو خیر خیریت کا خط لکھوا رہا تھا۔ ایک دو بار مزید انہوں نے ہمیں دیکھ لیا تو آفت آ جائے گی۔"

قدیر نے تیز لہجے میں کہا۔ "بس نکل گئی دوستی کے غبارے سے ہوا؟"

"یار! یہ بات نہیں' لیکن............"

"بس بس۔ زیادہ صفائی دینے کی ضرورت نہیں۔ اب میں نہیں کہوں گا تجھے ایسے خطرناک کام کے لئے۔"

وہ اٹھا اور پاؤں پٹختا ہوا واپس چلا گیا۔

چار پانچ روز قدیر بہت ناراض رہا۔ محبوب کو شکل تک نہیں دکھائی۔ آخر محبوب کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا اور اس نے منت سماجت کر کے قدیر کو خط "لکھوانے" پر آمادہ کیا۔

.... قدیر کی خواہش تھی کہ وہ اپنی تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کر دے۔ محبوب اچھی طرح جانتا تھا کہ اس خواہش کے پیچھے سارہ کی خواہش کار فرما ہے۔ قدیر آٹھویں جماعت کی کتابیں لے آیا تھا۔ وہ فارغ وقت میں محلے کے ایک ماسٹر صاحب سے پڑھتا تھا اور کبھی کبھار محبوب کا دماغ کھانے بھی بیٹھ جاتا۔ انگلش میں اسے دقت پیش آ رہی تھی

تاہم محبوب کا خیال تھا کہ وہ کوشش کرے تو اس مشکل میں سے نکل سکتا ہے لیکن پھر یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ انہی دنوں قدیر کے ایک تایا زاد بھائی نے دبئی سے اس کے لئے ویزا بھیج دیا اور قدیر کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بہتر مستقبل کی تلاش میں دبئی جانا پڑ گیا۔ محبوب اچھی طرح جانتا تھا کہ سارہ سے جدا ہونا قدیر کے لئے کتنا مشکل ہے لیکن بہتر مستقبل کے لئے اسے یہ سب کچھ کرنا تھا۔ روانگی سے چند روز پہلے قدیر نے محبوب سے سارہ کے نام ایک طویل خط لکھوایا۔ اس خط میں اس نے عہدِ محبت کی تجدید کی۔ سارہ کو باور کرایا کہ وہ پردیس میں ہر "پل" اس کی یاد کے سہارے کاٹے گا اور دور رہ کر بھی ہر وقت اس کے قریب رہے گا۔ وہ کوشش کرے گا کہ جب وہ واپس آئے تو اس قابل ہو کہ سارہ کو اپنا سکے۔

پھر ایک روز وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے محبوب کو خدا حافظ کہہ کر ائرپورٹ کے ڈپارچر لاؤنج میں داخل ہو گیا۔ اس کی اور محبوب کی دوستی کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ حائل ہو گیا۔

شروع شروع میں محبوب نے قدیر کی کمی شدت سے محسوس کی۔ یقیناً قدیر کی بھی یہی کیفیت ہو گی۔ ہر تیسرے چوتھے روز دبئی سے اس کا خط آ جاتا تھا۔ اس میں ایک خط علیحدہ سے سارہ کے لئے بھی ہوتا تھا۔ قدیر کا یہ خط سارہ تک پہنچانا بھی محبوب کی ذمے داری تھا۔ آغاز میں اسے بڑی جھجک محسوس ہوئی مگر پھر یہ کام یوں آسان ہو گیا کہ سارہ خود ہی موقع دیکھ کر خط وصول کرنے محبوب کے گھر آ جاتی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا' قدیر کے خطوں میں وقفے بڑھنے لگے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ اس کی دلی کیفیات ہمیشہ ایک سی نہیں رہتیں۔ وہ بہت جلد اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے۔ شاید قدیر بھی ایک ہی طرح کے خط لکھوا لکھوا کر اور جواب موصول کر کر کے اکتا گیا تھا۔ تحریر سے اس کا دل کہاں تک بہلتا۔ اسے سارہ کی ضرورت تھی اور سارہ اس سے بہت بہت دور تھی۔ محبوب محسوس کر رہا تھا کہ سارہ کے خطوط بھی اب جلدی جلدی دبئی نہیں پہنچتے تھے۔ غالباً وہ بھی ایک ہی طرح کی باتیں لکھ لکھ کر تھک گئی تھی۔ اس کی زندگی میں ایک عجیب سا ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ ایف ایس سی اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے بعد وہ گھر بیٹھ گئی تھی۔ والدین نہیں چاہتے تھے کہ وہ بسوں میں دھکے کھاتی کالج پہنچے اور راستے میں ان گنت میلی نظروں کا سامنا کرے۔ اس کا کوئی بھائی بھی نہیں تھا جو اسے کالج

پہنچانے اور واپس لانے کی ذمے داری اٹھاتا۔ وہ محبوب کو جب ملتی' خاموش اور اداس نظر آتی۔ قدیر نے اسے ایک انگوٹھی دی تھی۔ وہ ابھی تک اس کی انگلی میں چمکتی تھی۔

محبوب کا گھراب مکمل ہو چکا تھا۔ وہ لوگ کرائے کے مکان سے اٹھ کر اپنے نئے مکان میں آ گئے تھے۔ بہرحال قدیر اور سارہ والی گلی میں محبوب کا آنا جانا رہتا تھا۔ وہ اس گلی کو کیسے بھول سکتا تھا' یہ گلی تو اس کے دل میں آباد تھی۔ اس گلی کے مکان' اس کی دھوپ چھاؤں' اس کی خوشبو.......... سب کچھ محبوب کے ذہن میں رچ بس چکا تھا۔ ایک دن سارہ کی والدہ محبوب سے ملیں۔ کہنے لگیں۔ "بیٹا جی! سارہ آگے پڑھنا چاہتی ہے۔ کہتی ہے پرائیویٹ بی اے کرے گی۔ تمہاری نظر میں کوئی اچھی سی ٹیوشن ہو تو بتاؤ۔"

محبوب نے کہا۔ "ماسٹر کرامت صاحب ہیں آپ کے محلے میں۔ اچھا پڑھاتے ہیں۔ قدیر بھی ان سے پڑھتا رہا ہے۔ اگر آپ.........."

"نہیں بیٹا جی۔" سارہ کی والدہ نے محبوب کی بات کاٹی۔ "کوئی استانی وغیرہ ہو تو بتاؤ.......... لڑکی کا معاملہ ہے اور پتا نہیں کیا بات ہے' ماسٹر کرامت مجھے ویسے بھی اچھا نہیں لگتا۔"

محبوب نے کہا۔ "اچھا خالہ جی! میں کوشش کروں گا۔"

محبوب کے کہنے کا مطلب تھا کہ میں ٹیوشن ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا لیکن سارہ کی والدہ خالہ عطیہ نے اور مطلب لیا۔ کہنے لگیں۔ "بیٹا جی! اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ تم تو گھر ہی کے بندے ہو۔ اگر تم تھوڑا بہت وقت نکال سکو تو سارہ کا کام بن جائے گا۔ ویسے بھی بڑی عزت کرتی ہے تمہاری.......... تم پڑھاؤ گے تو پڑھے گی بھی بہت دل لگا کر۔"

محبوب سٹپٹا کر رہ گیا۔ وضاحت کرنا چاہ رہا تھا لیکن ہمیشہ کی طرح تھوڑی سی تاخیر کر گیا۔ اسی دوران میں خالہ عطیہ نے سارہ کو آواز دے دی۔ "سارہ بیٹی ادھر آ جلدی سے۔ یہ دیکھ تیرے بھائی جان آئے ہیں۔"

خالہ عطیہ اور محبوب' گھر کے صحن میں کھڑے تھے۔ سارہ تیزی سے باہر نکلی۔ اس کے کندھوں پر تولیا پڑا تھا اور گیلے بالوں سے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس کا چہرہ سفید گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اس منظر نے ایک لمحے کے لئے محبوب کو مبہوت کر دیا۔

"السلام علیکم محبوب بھائی جان۔" سارہ کی آواز نے محبوب کو چونکایا۔

خالہ عطیہ نے سارہ کو مخاطب کیا اور تیزی سے بولیں۔ "لے تیرے من کی مراد پوری ہو گئی۔ محبوب نے کہا ہے کہ وہ تجھے پڑھا دیا کرے گا۔"

"سچ!" سارہ نے حیرت سے کہا۔

اس کی پیشانی تمتمائی اور شعاع جیسی خوب صورت رگ ابھر آئی۔ ایک لمحے کے لئے محبوب کو لگا جیسے وہ خوشی سے ناچ اٹھے گی۔

محبوب نے ایک بار پھر وضاحت کرنا چاہی لیکن اس سے پہلے ہی سارہ نے بڑے خلوص سے اس کا ڈھیروں شکریہ ادا کر دیا اور محبوب کا جملہ معترضہ ہونٹوں پر آنے سے پہلے ہی دم توڑ گیا۔

اگلے روز سہ پہر کو محبوب' سارہ کے گھر بیٹھا اسے انگلش پوئٹری پڑھا رہا تھا۔ محبوب پہلے سے جانتا تھا کہ سارہ کی قربت اس کے اندر کچھ انقلابی تبدیلیاں رونما کرے گی۔ وہ ان تبدیلیوں سے بہت خوف زدہ تھا لیکن ان تبدیلیوں میں کوئی ایسی کشش بھی تھی جو مقناطیس کی طرح اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ یہ تبدیلیاں اس کے لئے بیک وقت اذیت ناک بھی تھیں اور فرحت بخش بھی۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ سارہ اس کے پیارے دوست کی محبت تھی لیکن وہ اس کے بارے میں کبھی کبھی عجیب سے انداز میں سوچنے لگتا تھا' اور جب وہ اس انداز سے سوچ رہا ہوتا تھا تو قدیر کا خیال اس کے ذہن سے بالکل محو ہو جاتا تھا۔ وہ کوشش کرتا کہ سارہ کو پڑھانے کے دوران میں اس کی تمام تر توجہ پڑھائی پر مرکوز رہے۔ وہ اپنے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری کر لیتا' اپنی سوچوں پر پہرے بٹھاتا اور اپنی گفتگو کو صرف ضروری موضوعات تک محدود رکھتا لیکن پھر بھی کسی وقت چپکے سے اس کا دفاعی حصار ٹوٹ جاتا اور وہ محسوس کرتا کہ وہ غیر ضروری چیزوں کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ مثلاً سارہ کی اس انگلی کے بارے میں جو کتاب پر رینگ رہی ہے۔ اس آنچل کے بارے میں جو پنکھے کی ہوا سے بار بار اڑتا ہے اور محبوب کے پاؤں کو چھو جاتا ہے اور اس پیشانی کے بارے میں جو حدت سے تمتما رہی ہے۔ اپنی چوری پکڑ کر وہ شرمندہ سا ہو جاتا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ یہ تو بالکل عامیانہ سی بات تھی۔ نوجوان لڑکا نوجوان لڑکی کو تنہائی میں پڑھانے بیٹھے اور وہ اس لڑکی کے بارے میں سوچنا شروع کر دے تو یہ ایک عامیانہ بات ہی ہوئی نا اور محبوب عام لڑکا نہیں تھا۔ وہ خود کو خاص سمجھتا تھا اور لوگ اسے خاص سمجھتے تھے۔ وہ وقار صاحب کا بیٹا

تھا۔ دور و نزدیک اس گھرانے کی نیک نامی اور شرافت مشہور تھی پھر وہ ایسا گھٹیا پن کیوں کر رہا تھا' اور وہ بھی ایک ایسی لڑکی کے حوالے سے جو اس کے دوست کا پیار تھی۔

یہ شرمسار کرنے والی سوچ ذہن میں آتی تو وہ چور نظروں سے سارہ کی طرف دیکھتا۔ اسے شبہ ہونے لگتا کہ ہوا کی لہروں پر سفر کرکے اس کے خیالات سارہ تک پہنچ گئے ہیں اور وہ برا مان گئی ہے لیکن سارہ کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے خالی رہتا۔ وہ جیسے محبوب سے اور محبوب کی سوچوں سے' ہزاروں لاکھوں میل کے فاصلے پر پائی جاتی۔ اپنی کتابوں میں گم۔ معاشیات کے کسی سوال میں الجھی ہوئی یا انگریزی کے کسی شعر کی تشریح میں غلطاں۔

ایک ایسے ہی موقع پر جب وہ تفتیشی نظروں سے سارہ کا چہرہ دیکھ رہا تھا' وہ کتاب پر جھکے جھکے زیرلب مسکرائی اور بولی۔ "محبوب بھائی جان! ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں......... ہاں۔" محبوب نے چونک کر کہا۔

"برا تو نہیں مانیں گے؟"

"امید ہے کہ نہیں مانوں گا کیونکہ تم کوئی ایسی بات پوچھوگی ہی نہیں۔"

"اچھا تو نہیں پوچھتی۔"

"چلو پوچھ لو۔"

"جان بخشی کا وعدہ؟" وہ ادا سے بولی۔

"وعدہ۔" محبوب مسکرایا۔

"شہلا کا کیا معاملہ ہے؟"

محبوب ٹھٹکا پھر سنبھل کر بولا۔ "کوئی خاص معاملہ نہیں لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو۔"

"ایسے ہی دماغ میں بات آگئی تھی۔" سارہ نے کہا۔ اس کے چہرے پر شرم کی ہلکی سی سرخی جھلک آئی تھی۔

"یونہی تو کوئی بات دماغ میں نہیں آتی۔" محبوب نے اصرار کیا۔

"وہ در......... اصل......... میرا مطلب ہے آپ کی بات........."

"ایسا کچھ نہیں ہے۔" محبوب نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔

سارہ نے اس لہجے کو محسوس کرلیا اور فوراً موضوع بدل دیا۔ ناپسندیدہ موضوع کو

غیر محسوس طور پر بدلنے میں سارہ کو کمال حاصل تھا اور یہ اس کی ذہانت اور معاملہ فہمی کی ایک معمولی سی مثال تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ محبوب کو بھی پتا نہیں چلا کہ کب وہ شہلا والے موضوع سے ہٹ کر اکبر الہ آبادی کی طنزیہ شاعری پر بات کرنے لگے ہیں اور پھر اسلامیات کے نوٹس لکھنے لگے ہیں۔ بہرحال شہلا والی بات اس کے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ رہی اور وہ گھر آکر دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ سارہ نے شہلا کے بارے میں بات کی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ اشاروں کنایوں میں کئی بار شہلا کا ذکر کر چکی تھی۔ پتا نہیں وہ ایسا کیوں کرتی تھی۔ شہلا سے سارہ کا کوئی خاص تعلق نہیں تھا بلکہ تین چار مرتبہ سے زائد محبوب نے شہلا کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ شہلا نام کی یہ لڑکی محبوب کے والد وقار صاحب کے ایک دیرینہ دوست پروفیسر ریاض کی بیٹی تھی۔ اپنے والدین کے ساتھ محبوب کے گھر بھی آتی تھی۔ ایک مرتبہ یہ لوگ محبوب کے اہلِ خانہ کے ساتھ تفریحی ٹور پر ایبٹ آباد گئے تھے۔ شہلا نے محبوب سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی لیکن محبوب کی فطری جھجک آڑے آئی تھی اور معاملہ ٹائیں ٹائیں فش رہا تھا۔

شہلا پُرکشش لڑکی ضرور تھی لیکن ایسی بھی نہیں تھی کہ محبوب اس کے بارے میں کسی خاص زاویے سے سوچنے پر مجبور ہو جاتا۔ پھر ایک مرتبہ گھر میں شہلا کے ساتھ محبوب کے رشتے کی بات ہوئی تھی لیکن اس بات کو خاطر خواہ پذیرائی نہیں ملی تھی اور یہ معاملہ قریباً ختم ہو گیا تھا۔ سارہ کو اس معاملے کی نہ جانے کیسے بھنک پڑی تھی اور وہ اسے غیر ضروری اہمیت دینے لگی تھی یا شاید وہ دل لگی کے لئے یہ موضوع چھیڑ دیتی تھی' یعنی پڑھائی سے ہٹ کر کوئی ہلکی پھلکی بات کرنے کے لئے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ اس کی شوخ فطرت کے اظہار کا ایک انداز ہو یا پھر ایک اور بات بھی ہو سکتی تھی۔ یہ خیال بجلی کی طرح محبوب کے ذہن میں چمکا اور اس کے تن بدن میں عجیب سی سنسنی دوڑ گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اب سارہ کے خیال میں تبدیلی آرہی تھی۔ بالکل جیسے محبوب کے اپنے خیالات میں تبدیلی آرہی تھی۔ وہ قدیر کو بھولتا جا رہا تھا اور اب سارہ کی قربت اس کے دل میں ایک نئی کونپل کھلا رہی تھی۔ شاید اسی طرح سارہ بھی قدیر کو بھولتی جا رہی تھی اور اس کے دل و دماغ میں ایک نیا جذبہ پنپ رہا تھا۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے؟" محبوب نے بے حد حیرانی سے سوچا۔ "کیا سارہ ایسی لڑکی ہے

کہ اس انداز میں سوچ سکے؟"

محبوب نے سنا تھا کہ عورت زندگی میں صرف ایک بار پیار کرتی ہے اور یہ اس کا پہلا پیار ہوتا ہے۔ سارہ کا پہلا پیار تو قدیر تھا پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اب وہ محبوب کے حوالے سے اپنے دل میں کسی نازک جذبے کو جگہ دے۔ نہیں یہ صرف محبوب کا وہم تھا۔ یہ اس کے اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ تھی۔ دل کا شکستہ آئینہ تھا جو اسے بگڑی ہوئی شکلیں دکھا رہا تھا۔

ایک دن سارہ نے کہا۔ "محبوب بھاہی جان! آج میں نے "میری پسندیدہ شخصیت" کے عنوان سے مضمون لکھا ہے۔"

"دکھاؤ۔"

"پہلے آپ اندازہ لگائیں کہ یہ مضمون کس کے بارے میں ہوگا۔"

"مجھے کیا معلوم؟"

"یہ شخصیت میرے اردگرد کے ماحول میں سے ہے۔ اب GUESS کریں۔"

"تمہارے ابو ہوں گے یا پھر کوئی استاد وغیرہ۔"

"جی نہیں' یہ مضمون آپ کے بارے میں ہے۔"

محبوب کے سینے میں پھلجڑی سی چھوٹ گئی۔ اس نے کوشش کی کہ دلی تاثرات اس کے چہرے پر نہ آنے پائیں۔ معلوم نہیں وہ اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا۔

"اچھا' دکھاؤ تو مضمون۔" اس نے کہا۔

سارہ نے نوٹ بک اس کے سامنے کر دی۔ مضمون واقعی محبوب کے بارے میں تھا۔ سارہ نے بڑے خوب صورت پیرائے میں اپنے دلی جذبات بیان کئے تھے۔ اپنے مضمون میں اس نے پہلے محبوب کا تعارف کرایا تھا اور بتایا تھا کہ محبوب بھائی جان اس کے بے تکلف دوست ہونے کے علاوہ اس کے استاد کی حیثیت بھی رکھتے ہیں پھر لکھا تھا۔

"محبوب بھائی جان عام نوجوانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ کوئی بہت برگزیدہ روح ان میں حلول کر چکی ہے۔ سنجیدگی' متانت اور بردباری ان کا شعار ہے۔ نیک اور پارسا جیسے الفاظ ان کی صاف شفاف شخصیت کا احاطہ کرنے کے لئے قطعی ناکافی ہیں۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ وہ ایک ایسے شیشے کی طرح ہیں جس کے آرپار سب کچھ صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے چہرے پر سب سے خوب صورت ان کی آنکھیں

ہیں' شرمائی شرمائی' بے حد مہربان اور بے حد گہری۔ کسی سمندر کی طرح عمیق اور بیکراں۔ ساری دنیا ان میں ڈوب جائے اور پتا نہ چلے۔ ان کی ذات میں ایک سحر ہے۔ وہ جب میرے قریب ہوتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ ان کے سراپا سے پاکیزگی اور محبت کی لہریں پھوٹ رہی ہیں اور مجھ پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ کہتے ہیں' چاند اپنی روشنی سورج سے حاصل کرتا ہے۔ میں چاند تو نہیں ہوں لیکن کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ محبوب بھائی جان کی روشنی میں چمک اٹھتی ہوں۔ یہ روشنی نہ صرف مجھ پر اپنا آپ واضح کرتی ہے بلکہ میرے اردگرد کی ہر چیز کو بھی روشن کر دیتی ہے۔"

اس کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا تھا' جس میں محبوب کی ذاتی صفات کے علاوہ اس کے خاندانی پس منظر' اس کے حالات زندگی اور اس کی کامیابیوں پر بڑی باریک بینی سے روشنی ڈالی گئی۔

یہ مضمون محبوب کی تعریفوں سے بھرا ہوا تھا لیکن نہ جانے کیوں یہ مضمون پڑھ کر محبوب کو ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی۔ اسے یوں لگا جیسے سارہ نے خود زمین پر بیٹھ کر اسے ایک بلند و بالا کرسی پر بٹھا دیا ہے۔ یہ کرسی اتنی اونچی ہے کہ وہ ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا ہے۔ بالکل تنہا اور اکیلا۔ سارہ سے بہت دور مگر اس نے اپنے دلی جذبات سارہ پر ظاہر نہیں ہونے دیے۔

"جی بھاہی جان! کیسا ہے مضمون؟" اس نے پوچھا۔

"مضمون تو بہت اچھا ہے لیکن "میں" اس میں کہیں نظر نہیں آرہا۔"

"ہر سطر میں آپ ہی نظر آرہے ہیں جی۔"

"تمہیں نظر آرہا ہوں گا۔"

"اور میری نظر بالکل ٹھیک ہے۔ ذرا سا بھی فرق نہیں ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے ٹیسٹ کرائی تھی۔" پھر وہ ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "سچ کہتی ہوں محبوب بھاہی جان! آپ بہت اچھے لگتے ہیں مجھے۔ آپ.......... آپ کوئی مولانا ہوتے تو میں ضرور آپ کے ہاتھ پر.......... وہ کر لیتی۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے؟"

"بیعت۔"

"ہاں ہاں.......... آپ کی مرشد بن جاتی۔"

"مرشد نہیں مرید۔"

"بالکل وہی۔"

محبوب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اچھا مریدنی صاحبہ.......... اب یہ مسکے لگانا چھوڑو اور کتاب کی طرف توجہ دو۔ ایک ہفتے سے تم نے "اردو" کی شکل نہیں دیکھی اور ابھی ابھی مجھے پتا چلا ہے کہ اردو تمہاری کافی کمزور ہے۔"

گھر آکر بھی سارہ کا مضمون محبوب کے ذہن میں گھومتا رہا۔ ایک عجیب سا احساسِ ندامت طاری ہو رہا تھا اس پر۔ سارہ اسے کیا سمجھ رہی تھی اور وہ کیا تھا۔ سارہ کے حوالے سے کیسی کیسی سوچیں پرورش پاتی تھیں اس کے ذہن میں۔ وہ اسے آسمان کا تارا سمجھتی تھی اور وہ نالی میں پڑے کنکر جیسا تھا اور وہ صرف سارہ کا مجرم ہی نہیں تھا' اپنے پیارے دوست قدیر کا بھی مجرم تھا۔ قدیر نے دبئی جاتے ہوئے جو الفاظ اس سے کہے تھے وہ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ قدیر نے کہا تھا۔ "سارہ کا خیال رکھنا شہزادے! وہ کسی وقت بہت دکھی ہو جاتی ہے۔ اس سے ملتے جلتے رہنا۔"

قدیر اسے اپنی محبت کا نگہبان بنا کر گیا تھا۔ وہ کیسی نگہبانی کر رہا تھا۔ اپنی نگاہ کی نگہبانی ہی نہیں کر سکا تھا۔

انہی دنوں کالج کی ڈرامیٹک سوسائٹی نے ایک ڈراما اسٹیج کیا۔ اس ڈرامے کا مرکزی کردار محبوب نے لکھا تھا۔ دوستوں نے محبوب کو بھی زبردستی ایک رول پلے کرنے پر مجبور کر دیا۔ ڈرامے کا عنوان تھا۔ "دو قبروں کی داستان۔" یہ دو سگے بھائیوں کی کہانی تھی۔ دونوں آپس میں بہت محبت رکھتے ہیں لیکن غلط فہمی کے سبب ایک بھائی دوسرے کی جان لے لیتا ہے۔ محبوب نے مرنے والے بھائی کا کردار ادا کیا تھا اور ایسی خوبی سے کیا تھا کہ سب اش اش کر اٹھے تھے۔ محبوب فطرتاً ایک کم آمیز اور بہت حد تک شرمیلا نوجوان تھا۔ دوسروں کی تو اور بات ہے اسے خود بھی یقین نہیں تھا کہ وہ یہ رول عمدگی سے نبھا جائے گا مگر اس نے نبھایا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ رول بے حد سنجیدہ تھا اور محبوب کی طبع سے مطابقت رکھتا تھا۔ اسٹیج پر پہنچ کر جب اس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیلی تو یہ تاثر کردار کی ڈیمانڈ کے عین مطابق نظر آیا۔

کالج کے آڈیٹوریم میں کھیلا جانے والا یہ ڈراما سارہ نے بھی دیکھا۔ وہ محبوب کی بڑی بہن راحت کے ساتھ آئی تھی۔ ڈرامے کے آخری مناظر میں محبوب اپنے بھائی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ اس کے سینے میں گولی لگتی ہے اور وہ چند جذباتی مکالمے بول کر ایک

صوفے پر گرتا اور دم توڑ دیتا ہے۔ بڑے دل سوز مکالمے تھے۔ محبوب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ "مر" گیا تب بھی آنسو اس کے رخساروں پر پھسلتے رہے۔ ہال میں موجود تماشائیوں پر سکتہ طاری تھا لیکن ہال میں مخالف لڑکوں کی ایک ٹولی بھی تھی۔ ان میں سے ایک لڑکا چیخا۔ "اوئے دیکھو! مردہ رو رہا ہے۔"

دوسرا بولا۔ "اوئے مرا نہیں ہے۔ مکر کر رہا ہے۔"

تیسرے نے کہا۔ "بھئی جوتی سونگھاؤ۔ ابھی اٹھ بیٹھے گا۔"

پہلے لڑکے نے پھر کہا۔ "کوئی چیز مار کر دیکھو۔"

کوک کی ایک خالی بوتل اڑتی ہوئی آئی اور ایک اداکارہ لڑکی کے پاؤں میں گری۔ دوسری بوتل بے سدھ لیٹے محبوب کے سینے پر لگی۔ تکلیف کی شدت سے اس کا جسم جھنجھنا اٹھا' لیکن وہ اپنے کردار کا بھرم رکھنے کے لئے بے سدھ پڑا رہا۔ اسی دوران میں ہال کے اندر ہنگامہ شروع ہو گیا اور پردہ کھینچ دیا گیا۔ مصنوعی مونچھیں اور وگ وغیرہ اتار کر محبوب ہال میں پہنچا تو اس نے عجیب منظر دیکھا۔ سارہ نے ایک نوجوان کا گریبان پکڑ رکھا تھا اور اسے بری طرح جھنجوڑ رہی تھی۔ نوجوان کی قمیض تار تار ہو گئی تھی۔ کچھ لوگ نوجوان کو سارہ کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بری طرح بپھری ہوئی تھی اور گرج رہی تھی۔ "بے ہودہ' بدتمیز' بدمعاش۔ تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو.......... میں تمہارا خون پی جاؤں گی!"

نوجوان اب کافی گھبرایا ہوا تھا اور جان چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک لڑکے نے لجاجت سے کہا۔ "چلو چھوڑ دو مس۔ غلطی ہو ہی جاتی ہے۔"

ایک دوسرا شخص بولا۔ "یہ غلطی نہیں' بدمعاشی ہے۔ اچھا بھلا پلے چل رہا تھا ستیاناس کر دیا پکڑ کر۔"

سارہ بولی۔ "پلے تو رہا ایک طرف اگر بوتل محبوب صاحب کے سر پر یا منہ پر لگ جاتی۔"

محبوب کے ایک دوست نے پوچھا۔ "بھئی! محبوب ہے کہاں؟ اسے تو دیکھو۔"

محبوب نے کہا۔ "میں یہ ہوں بھئی۔ بالکل ٹھیک ہوں میں.......... آپ لوگ چھوڑ دو اس کو۔ خواہ مخواہ بات بڑھانے سے فائدہ نہیں۔"

محبوب کی بہن راحت لپک کر اس کے پاس آئی اور فکر مندی سے اس کی خیریت

دریافت کی۔ اسی دوران میں ایک دو پروفیسر صاحبان بھی موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے سارہ سے بمشکل نوجوان کی جان چھڑائی اور معاملہ رفع دفع کیا۔

شام کو جب محبوب ٹیوشن پڑھانے سارہ کے گھر گیا تو وہ اپنی کلائی پر پٹی باندھے بیٹھی تھی۔ دھینگا مشتی کے دوران میں اس کی چوڑی ٹوٹ کر اپنی ہی کلائی میں چبھ گئی تھی۔

محبوب اس پر تھوڑا سا ناراض بھی ہوا۔ "تمہیں کیا ضرورت تھی یہ ہنگامہ کرنے کی؟ انتظامیہ کے لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ وہ خود ہی سنبھال لیتے۔"

"مجھ سے برداشت نہیں ہوا بھاجی جان۔ بے ہودگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ شکر ہے خدا کا کہ آپ کو کوئی چوٹ نہیں آئی ورنہ اس کتے نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ ہم سے اگلی والی رو میں بیٹھا تھا۔ پہلی بوتل پھینکنے کے بعد دوسری اٹھانے جا رہا تھا۔ میں نے پیچھے سے ہی اس کے بال پکڑ لئے۔"

"بھئی' وہ خطرناک لوگ ہیں۔ اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ جاتا تو پھر؟"

"اور اگر آپ کو نقصان پہنچ جاتا تو؟ میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ اس کا قیمہ بنا دوں۔"

محبوب نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا پھر ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ "سارہ! تم مجھے اتنی اہمیت مت دیا کرو۔ میں سچ کہتا ہوں میں اتنی اہمیت اور عزت کے قابل نہیں ہوں۔"

وہ رسان سے بولی۔ "یہ میں آپ سے زیادہ جانتی ہوں کہ آپ کتنی عزت کے قابل ہیں' محبوب بھاجی جان! میرے بس میں ہو تو آپ.........."

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ محبوب کا دل انوکھے انداز میں دھڑک اٹھا۔ کانوں میں شادیانے سے بج اٹھے۔ "بات ادھوری کیوں چھوڑ دی؟" اس نے پوچھا۔

وہ بولی۔ "میرے بس میں ہوتا' تو آپ کے لئے اپنے ہاتھ سے دلہن لاؤں اور ایسی دلہن لاؤں.......... ایسی دلہن لاؤں کہ جو ساری عمر آپ کے گھر میں خوشیاں بکھیرتی رہے۔ آپ کی اتنی خدمت کرے' آپ کا اتنا خیال رکھے کہ آپ زندگی بھر مجھے دعائیں دیتے رہیں۔"

سارہ کے جواب نے اس شعلے پر پانی پھینک دیا جو چند لمحے پہلے بھک سے اس کے سینے میں بھڑکا تھا۔ اسے لگا کہ اس کے چہرے پر مایوسی کی گہری پرچھائیاں پھیلنے والی ہیں۔ ان پرچھائیوں سے بچنے کے لئے اس نے جلدی سے کہا۔ "تو پھر ڈھونڈو نا کوئی۔"

"ڈھونڈنا کیا ہے۔" وہ بولی۔ "آپ تو پہلے سے ڈھونڈ بیٹھے ہیں۔ ویسے شہلا بھی تو کوئی ایویں شیویں نہیں ہے۔ میں ایک دن آپ کے گھر ملی تھی اس سے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ بہت خوش رکھے گی آپ کو۔ دل و جان سے چاہے گی۔"

"لیکن تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں بھی شہلا کو چاہوں گا۔"

"بنیں مت۔" وہ ادا سے بولی۔ "ہم سب جانتے ہیں بھاجی جان۔ آپ شہلا جی سے بہت بہت پیار کرتے ہیں۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"دیکھیں جی! میں نے آپ کو معاملے پر بہت غور کیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ شہلا سے آپ کی محبت کے چاند کو آپ کی خاموشی اور شرمیلے پن کے بادلوں نے ڈھانپ رکھا ہے.......... چاند نظر نہیں آ رہا لیکن چاند موجود تو ہے نا۔"

محبوب نے کہا۔ "جسے تم چاندنی رات سمجھ رہی ہو' وہ ہو سکتا ہے اماوس کی رات ہو۔"

سارہ کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا۔ اس نے گہری نظروں سے محبوب کو دیکھا لیکن پھر ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولی۔ "آج آپ ہمیشہ سے زیادہ غم زدہ نظر آ رہے ہیں.......... کہیں ہماری شہلا باجی سے کوئی ان بن تو نہیں ہو گئی۔"

موضوع بدلنے میں وہ واقعی اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بات کو کسی اور طرف لے کر نکل گئی اور چاندنی رات و اماوس والا معاملہ وہیں کا وہیں اٹکا رہ گیا۔

اس دن کے بعد محبوب کو عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا۔ یہ اپنی ہی ذات کا اور ذات میں بپا ہونے والے ہیجان کا خوف تھا۔ چاندنی رات اور اماوس کی رات کی بات کرتے ہوئے وہ ایک دم کتنا سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس سنجیدگی میں اگر کوئی الٹی سیدھی بات اس کے منہ سے نکل جاتی تو کیا ہوتا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا اس کے دل و دماغ میں پیدا ہونے والے ابال کی ہلکی سی آنچ بھی سارہ تک پہنچے۔ وہ اسے عزت و تکریم کے زینوں پر چلا کر رتبے کی اس بلندی تک لے گئی تھی کہ وہاں سے گرنے کا تصور بھی اس کے لئے جانکاہ تھا۔ تو پھر وہ کیا کرے؟ وہ تمام اخلاقی اور سماجی قیود کو توڑ کر ہر وقت اس کے ذہن پر سوار رہتی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے ہر وقت اسی کا خیال محبوب کے در دل پر دستک

دیتا تھا۔ اسے کیا ہو گیا تھا۔ شاید یہ وہی شہرۂ آفاق جذبہ تھا جسے عشق کہا جاتا ہے۔ گلابی شاموں میں جب آسمان پر بادلوں کی سرخ کناروں والی ٹکڑیاں تیرتیں تو محبوب کو ان میں سارہ کی شبیہہ نظر آتی۔ تاروں بھری رات سارہ کا آنچل بن جاتی اور آسمان پر چاند سارہ کی روشن پیشانی کی طرح دمکتا۔ وہ رات رات بھر تصور میں اس پیشانی کو دیکھتا اور چومتا رہتا۔ صبح کا اجالا سارہ کے مکھڑے جیسا ہوتا اور سرما کی تمازت بھری دوپہر میں سارہ کے بدن کی حرارت اور نرمی جذب ہو جاتی۔

ایک رات جب وہ ٹھٹھری ہوئی چاندنی میں چھت پر ٹہل رہا تھا' اور قریباً ایک فرلانگ دور سارہ کے گھر کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی کو کسی جاں نثار پروانے کی طرح دیکھ رہا تھا' ایک دم اسے جھٹکا سا لگا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی خواب سے بیدار ہوا ہے۔ اس کے ذہن میں بالکل اچانک ہی "قدیر" کا خیال آگیا تھا۔ وہ اس نام کو یوں بھولا ہوا تھا جیسے کوئی اس آسمان کو بھول جائے جو ہر وقت سر پر سایہ فگن رہتا ہے' یا اس ہوا کو بھول جائے جس میں وہ ہر وقت سانس لیتا ہے' یا اس دھرتی کو جس پر چلتا پھرتا ہے۔ قدیر تو اس کی زندگی کا ایک اٹوٹ انگ تھا' پھر وہ اسے کیوں بھول گیا تھا۔ چند دنوں یا چند ہفتوں کے لئے ہی سہی لیکن قدیر کا نام اس کے ذہن سے کیوں نکلا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی خطا تھی۔ محبوب نے جتنا سوچا اتنا ہی عرقِ ندامت میں ڈوبتا چلا گیا۔ سارہ قدیر کی محبوبہ تھی اور وہ اس سے عشق فرما رہا تھا اور عشق بھی ایسا جس میں ایکا ایکی دنیا جہان کی شدتیں سمٹ آئی تھیں۔ وہ ایک گناہ کر رہا تھا اور اس گناہ کی سزا اسے ملنی چاہئے تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ سزا کیا ہو سکتی ہے۔ وہ اب سارہ کے گھر نہیں جائے گا........ لیکن یہ ایک چھوٹی سزا تھی۔ وہ کبھی سارہ سے بات نہیں کرے گا' یہ بھی ایک چھوٹی سزا تھی۔ وہ کبھی سارہ کو اپنی شکل نہیں دکھائے گا۔ یہ سزا بھی اس کے گناہ سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ اس ٹھٹھری ہوئی رات میں چھت پر ٹہلتے ٹہلتے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ لاہور چھوڑ کر چلا جائے گا۔ وہ گریجویشن کر چکا تھا۔ راولپنڈی میں اسے ایک پرائیویٹ فرم اچھی جاب دے رہی تھی۔ محبوب کے والد نہیں چاہتے تھے کہ محبوب تعلیم ادھوری چھوڑ کر ملازمت کرے لیکن وہ ملازمت اور تعلیم کا سلسلہ ساتھ ساتھ جاری رکھنا چاہتا تھا۔ والد صاحب کے اعتراض کا جواب بڑے احترام سے دیتے ہوئے محبوب نے کہا تھا۔ "ابا جان! آپ نے بھی تو ملازمت اور تعلیم کو ایک ساتھ اپنائے رکھا تھا۔" وقار صاحب نے جواب دیا تھا۔ "بیٹا

جی' میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے آگے جاؤ۔ جب بوجھ بہت زیادہ ہو جائے تو آدمی بہت دور تک نہیں جا سکتا۔"

وقار صاحب کی مدلل باتوں نے محبوب کو خاصی حد تک قائل کر لیا تھا لیکن اب سارہ کے حوالے سے محبوب کے دل و دماغ میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں' انہوں نے ایک بار پھر محبوب کو نیا آسمان ڈھونڈنے پر مائل کر دیا۔ اسے لاہور اور لاہور کے در و دیوار سے وحشت سی ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا' اس کے پر لگ جائیں اور وہ اڑ کر یہاں سے نکل جائے.......... صرف پانچ چھ روز بعد اس کے ارادے رنگ لے آئے۔ ایک روز علی الصباح جب ابھی لاہور اور لاہور کے باسی گہری نیند سو رہے تھے' وہ لاہور ریلوے اسٹیشن سے راولپنڈی کے لئے روانہ ہو رہا تھا۔

☆==========☆==========☆
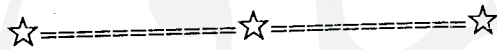
ان دنوں کمپیوٹر نیا نیا متعارف ہوا تھا۔ جن دفاتر میں کمپیوٹر کا استعمال شروع ہوا تھا وہاں کمپیوٹر آپریٹرز اور پروگرامرز کی زبردست مانگ تھی۔ محبوب کے پاس پروگرامنگ کا ڈپلومہ تھا' اسی ڈپلومہ کی بنیاد پر اسے یہ ملازمت ملی تھی۔ رہائش اور سواری کی سہولتیں حاصل تھیں۔ ایک خانساماں بھی ملا ہوا تھا۔ چار پانچ کمروں والا ایک صاف ستھرا گھر تھا جہاں محبوب اپنے ایک ساتھی پروگرامر ارشد خاں کے ساتھ رہائش پذیر ہوا۔ ارشد خاں ایک لاابالی نوجوان تھا۔ شکل وصورت اچھی تھی' باتیں بھی خوب کرتا تھا' یہی وجہ تھی کہ صنفِ مخالف میں بھی اسے مقبولیت حاصل تھی۔ لڑکیاں اس سے ملنے کے لئے آتی رہتی تھیں۔ ارشد خاں کے پاس ایک ون ٹو فائیو موٹر سائیکل تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی کسی منظورِ نظر کے ساتھ آؤٹنگ کے لئے بھی نکل جاتا تھا۔ اسے محبوب کے روکھے پھیکے روز و شب پر حیرت ہوتی تھی۔ ایک دن کہنے لگا۔ "یار! تم نے تو اپنے نام کی بھی لاج نہیں رکھی۔ محبوب ہو کر بھی کسی کے محبوب نہیں ہو تم........ ارے یار جوانی میں آنکھ نہیں لڑاؤ گے تو کیا بڑھاپے میں لڑاؤ گے۔"

"بس یار طبیعت اس طرف نہیں آتی۔"

"طبیعت اس طرف نہیں آتی یا ویسے گھبراتے ہو۔" پھر اس کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "یار تم کوئی اسکول بوائے تو نہیں ہو۔ اچھے بھلے ملازمت پیشہ نوجوان ہو۔ اس عمر میں لڑکی پھنسانا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ بس تھوڑی سی ہمت کر لے بندہ تو سارے کام

آسان ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کچے دھاگے سے بندھی آتی ہے سرکار میری۔“

”اچھا کبھی فرصت ملی تو سوچیں گے اس بارے میں بھی۔“

ارشد بولا۔ ”پنجابی کا محاورہ ہے سوچیں پیا تے بندہ گیا۔ ویسے بھی نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ آگے تمہاری مرضی بھئی۔“

ارشد نے جو بات مذاق مذاق میں کہی تھی وہ بہت حد تک ٹھیک بھی تھی۔ صنف مخالف سے رابطہ کرنے کے معاملے میں محبوب ہمیشہ سے صفر تھا۔ وہ کم عقل نہیں تھا، پڑھا لکھا تھا، سمجھ دار تھا، کئی معاملات میں وہ خاصی دلیری کا مظاہرہ بھی کرتا تھا لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی کہ اس کے اور صنفِ مخالف کے درمیان ہمیشہ ایک دیوار حائل رہی تھی۔ شاید یہ کوئی ایسی صفت تھی جو اسے وراثت میں ملی تھی یا پھر بچپن اور لڑکپن میں اس کی تربیت ہی ایسے انداز سے ہوئی تھی۔ لاہور سے راولپنڈی پہنچنے کے بعد اس کے ذہن میں یہ خیال کئی بار آیا تھا کہ وہ سارہ کی طرف سے اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرے اور اس کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ کسی معقول لڑکی میں دلچسپی لینے لگے۔ یہاں ارشد خاں کی مصروفیات دیکھ کر اس کے ارادے کو مزید تقویت ملی تھی، لیکن اس نے جب بھی اس بارے میں سنجیدگی سے سوچا تھا، اس کی چھٹی حس نے ناکامی کی پیش گوئی کردی تھی۔ اس کے دل نے گواہی دی تھی کہ وہ کوشش کے باوجود کسی معقول لڑکی سے راہ و رسم پیدا نہیں کرسکے۔ اس حوالے سے جب بھی بات بنتی نظر آئے گی، جب بھی کوئی فیصلہ کن لمحہ اس کا ہاتھ تھامنا چاہے گا، ایک فطری تذبذب اور گریز اس پر حاوی ہوجائے گا اور اس سے وہ ”تھوڑی سی دیر“ سرزد ہوجائے گی جو اسے ہمیشہ محرومی سے دوچار کرتی رہی ہے۔

وہ کئی ہفتے اپنے آپ سے ہی دست و گریباں رہا۔ اس دلفریب لیکن جاں گسل تصور سے لڑتا رہا جس نے راولپنڈی پہنچ کر بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ یہ سارہ تصور تھا جو روز بہ روز بے باک اور بے لگام ہوتا جا رہا تھا۔ اب صرف سارہ کی پیشانی اور رخسار اور ہونٹ ہی اس کے تصور میں نہیں چمکتے تھے، اب اس کا سیمیں بدن بھی اس کے خیالوں میں مہکتا تھا۔ اس غنچہ دہن کے نشیب و فراز اس کے وجود میں شعلے بھڑکاتے تھے۔ رات کے ریشمی اندھیرے میں کی جانے والی دلگداز سرگوشیاں اس کے کانوں میں گونجتی تھیں اور اس کے لہو میں چنگاریاں بکھیر دیتی تھیں۔ وہ ساری ساری رات بستر

کروٹیں بدلتا رہتا۔ جب بے قراری بہت بڑھ گئی تو اس نے از خود اپنا تجزیہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ یہ سوچنے لگا کہ نفسیاتی طور پر اس مسئلے کا حل کیا ہے۔ نفسیاتی حل شاید یہی تھا کہ اس کے اندر بھڑکتے ہوئے شعلوں کو پانی کے چھینٹوں کی ضرورت تھی۔ صنفِ مخالف سے مسلسل دوری نے اس کے اندر جو آگ بھڑکائی تھی اسے ٹھنڈا کرنے کی ضرورت تھی۔ اس آگ کو بجھانے کے لئے ایک روز وہ تن تنہا شہر کے ایک ایسے حصے میں جا پہنچا تھا جہاں حسن فروخت ہوتا تھا۔ نہ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جس کے تحت اس کے قدم خود بخود اٹھتے چلے گئے تھے اور جب اسے ہوش آیا تو وہ بازارِ حسن کی ایک گلی میں کھڑا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے صورت حال پر غور کیا اور خود سے یہ سوال پوچھا کہ ’کیا یہ میں ہی ہوں؟ محبوب احمد ولد وقار احمد ایک نہایت شریف النفس اور نیک نام نوجوان۔ گلی محلے میں اور عزیز و اقارب میں جس کی شرم و حیا اور پارسائی کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ جواب ”ہاں“ میں تھا اور اس جواب کی تصدیق وہ منظر کر رہا تھا جو دور تک محبوب کی نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ وہ ایک طویل گلی تھی۔ دونوں طرف دو منزلہ اور سہ منزلہ مکان تھے۔ بالکونیاں، چھجے، کھڑکیاں اور دروازے............ کہیں نزدیک سے ہی گھنگھروؤں کی چھناچھن، طبلے کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر فضا میں پھیل رہی تھی۔ جس جگہ محبوب کھڑا تھا وہاں سے گلی کا آغاز ہوتا تھا۔ یہاں پان سگریٹ کی دکانیں تھیں۔ تکے کباب کی خوشبو تھی، پھلوں کے ٹھیلے تھے اور گل فروشوں کے کیبن تھے۔ یہ سب پسندیدہ خوشبوئیں تھیں لیکن یہ ساری خوشبوئیں ایک سیلن زدہ ناپاک بو میں لپٹ کر بدبو بن گئی تھیں۔ وہ ایک ابر آلود دن کی گیلی گیلی سی دوپہر تھی۔ محبوب کا دل اس کی کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا اور ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو گئی تھیں۔ یہاں کوئی اسے جاننے والا نہیں تھا، پھر بھی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ہر نظر اسی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس کا مضحکہ اڑا رہی ہے۔ جیسے پوری کائنات ایک آنکھ بن گئی ہے اور اس لمحے کا انتظار کر رہی ہے جب وہ اس بدنام گلی میں داخل ہوگا اور کسی دروازے کے پیچھے اوجھل ہوگا۔

”کیا کروں؟ جاؤں کہ نہ جاؤں؟“ وہ بار بار خود سے ہی پوچھ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک باریش دیہاتی نوجوان کو دیکھا۔ اس نے اپنا چہرہ مفلر میں چھپا رکھا تھا اور دوڑتا ہوا گلی کے ایک موڑ سے برآمد ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ایک پولیس والا تھا۔ پولیس والے کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا اور وہ گالیاں بک رہا تھا پھر اس نے بھاگتے بھاگتے اپنا ڈنڈا دیہاتی نوجوان پر

کھینچ مارا تھا۔ ڈنڈا نوجوان کی ٹانگوں میں الجھا تھا اور وہ گرتے گرتے بچا تھا۔ ان لمحات میں نوجوان کا مفلر کھل گیا تھا اور محبوب کو پتا چلا کہ اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی ہے۔ نوجوان کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا ایک بغلی گلی میں غائب ہو گیا تھا۔

اس منظر نے محبوب کا حوصلہ مزید پست کر دیا تھا۔ بدنام گلی میں داخل ہونا اسے اتنا ہی مشکل نظر آنے لگا جیسے تلوار کی دھار پر ننگا پاؤں رکھنا۔ وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر ایک ٹھیلے والے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ بالکونیوں اور دروازوں میں عورتیں موجود تھیں۔ انہوں نے رنگ برنگے کپڑے پہن رکھے تھے اور چہروں پر سرخی پاؤڈر تھوپ رکھا تھا۔ کیا یہی وہ صنفِ نازک تھی جس کی تلاش میں محبوب یہاں پہنچا تھا؟ کیا وہ واقعی صنفِ نازک تھی؟ ان عورتوں کا بناؤ سنگھار انہیں اور بھی بدصورت اور قابل رحم بنا رہا تھا۔ وہ ایسی کھنڈر عمارتوں کی مثال تھیں جن پر چراغاں کرنے کی بھونڈی کوشش کی گئی ہو۔

محبوب کے قریب ہی سترہ اٹھارہ سال کا ایک اور لڑکا بھی کھڑا تھا۔ محبوب کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھی اسی کی طرح ”معرکہ“ سر کرنے کے لئے یہاں پہنچا ہے۔ وہ اضطراب کے عالم میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ پندرہ بیس قدم دور دروازے میں کھڑی ایک درمیانی عمر کی گٹھی ہوئی عورت اسے مسلسل اشارے کر رہی تھی۔ لڑکے نے دو تین بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیری‘ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ عورت کی طرف بڑھ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں غڑاپ سے دروازے کے پیچھے اوجھل ہو چکے تھے۔ بمشکل دو منٹ بعد اندر سے تیز تیز بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ فاصلہ زیادہ تھا لہٰذا یہ آوازیں محبوب کے لئے ناقابلِ فہم تھیں۔ بس یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ عورت کسی بات پر غصے سے چیخ رہی ہے۔ پھر دھڑ سے دروازہ کھلا۔ لڑکے کا اونی مفلر اڑتا ہوا گلی میں آگرا۔ گٹھی ہوئی عورت کا چہرہ نظر آیا۔ وہ گرج رہی تھی۔ ”سالا‘ حرامی‘ لڑکی مانگتا ہے۔ میں تجھے بڈھی نظر آتی ہوں۔ دفعان ہو یہاں سے.......... نکل..........“

لڑکا سر جھکائے ہوئے باہر نکلا۔ اس نے جلدی سے اپنا مفلر اٹھایا اور عرقِ ندامت ٹپکاتا وہاں سے کھسک گیا۔ غالباً وہ یہ سمجھ کر اندر گیا تھا کہ ”عورت“ اس کے لئے کسی لڑکی کا بندوبست کرے گی لیکن وہ تو خود ہی بندوبست تھی۔ لڑکا سٹپٹا گیا تھا اور نتیجے میں خوار ہو کر نو دو گیارہ ہو گیا تھا۔

محبوب کی ہمت اب بالکل جواب دے گئی تھی۔ وہ واپس پلٹنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ

ٹھیلے والے نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”کیا بات ہے باؤ؟ گھبرا رہے ہو؟ آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے کہا اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر محبوب کو لے کر گلی میں داخل ہو گیا۔ محبوب کی رگوں میں خون کی گردش انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی لڑکھڑا کر گر جائے گا۔ گرد و پیش اس کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ رنگ برنگے کپڑے‘ سرخی پاؤڈر سے پوتے ہوئے چہرے‘ معنی خیز اشارے‘ سب کچھ اس کی نگاہوں میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔ ٹھیلے والا‘ محبوب کو گلی میں قریباً ایک فرلانگ چلانے کے بعد ایک شکستہ دروازے کے سامنے لے آیا۔ یہاں ایک جواں سال عورت موجود تھی۔ بلکہ شاید وہ لڑکی ہی تھی لیکن اس بستی کے زہریلے موسم میں عورت نظر آنے لگی تھی۔

”کتنے پیسے ہیں؟“ عورت یا لڑکی کی آواز کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

محبوب نے کوئی جواب بھی دیا تھا لیکن اسے وہ جواب یاد نہیں۔ وہ عورت کے ساتھ ایک کمرے میں پہنچا تھا لیکن اسے وہ کمرا یاد نہیں۔ کوئی چہرہ اس کے قریب آیا تھا لیکن اسے وہ چہرہ یاد نہیں۔ بس اسے اتنا یاد ہے کہ وہ ایک بیمار سا لمس تھا جو اس سے لپٹ گیا تھا۔ ایک ناگوار حرارت تھی جو اسے محسوس ہوئی تھی۔ ایک سیلن زدہ سی باس تھی جس نے اس کے ہوش و حواس کو مختل کیا تھا لیکن پھر یہ باس ایک جھونکے کی طرح آگے نکل گئی تھی‘ محبوب کے کھوئے ہوئے حواس اسے واپس مل گئے تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد اس نے خود کو اس بدنام گلی سے دور ایک مصروف چوک میں پایا تھا۔ اس نے ایک تانگے والے کو ہاتھ دیا تھا اور تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھ کر اور اپنے گھر کا پتا بتا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ان لمحوں میں وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سارہ کے غم کی دھار ایک دم کند ہو گئی ہے۔ اس آگ پر چھینٹے پڑ گئے ہیں جو اسے ”رقصِ مرگ“ پر مجبور کر رہی تھی۔ جو مقصد لے کر آج وہ اپنے گھر سے نکلا تھا‘ وہ پورا ہو گیا تھا۔

لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ اس کی بیماری میں جو افاقہ ہوا تھا وہ بالکل عارضی تھا۔ دو تین دن بعد ہی سارہ کا غم ایک بار بھرپوری شدت سے اس پر حملہ آور ہو گیا بلکہ اس مرتبہ اس غم کی شدت پہلے سے سوا تھی۔ وہ تمتماتی پیشانی‘ وہ لب و رخسار ایک بار پھر اس کے پردہ خیال سے چپک گئے تھے جن کی یاد اس کے لئے سوہانِ روح تھی۔ محبوب

کا یہ خود ساختہ مفروضہ بالکل غلط ثابت ہوا تھا کہ کوئی اور عورت سارہ کی جدائی کا مداوا کر سکتی ہے۔ محبوب کا خیال تھا کہ سارہ کا عشق ایک "بھوک" ہے۔ بھوک جو روٹی سے مٹائی جا سکتی ہے اور روٹی نہ ملے تو چاول سے مٹائی جا سکتی ہے۔ وہ بے خبر تھا کہ یہ جسم کی بھوک نہیں وجود کا عشق ہے اور ایک "بیماری" ہے، جس کے لئے صرف ایک مخصوص دوا کارگر ہے۔ بدنام گلی میں رہنے والی وہ عورت نما لڑکی اس "بیماری" کا بال بھی بیکا نہیں کر سکی تھی جس کا تعلق سارہ سے تھا۔ اس تجربے میں محبوب کو سوائے ندامت اور پچھتاوے کے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ ایسے تجربات کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں، سارہ کا غم ایک اٹل حقیقت ہے اور رہے گا۔

اس روز اس نے ایک دم پینترا بدل لیا اور وہ خوب مل مل کر نہایا اور اپنے جسم سے لپٹی ہوئی ہر غلاظت پانی اور صابن کے ملغوبے میں بہا دی۔ اس روز اس نے صاف ستھرے سفید کپڑے پہنے، خوشبو لگائی اور جمعے کی نماز بڑے خشوع و خضوع سے ادا کی۔ اس نے نماز کی پابندی شروع کر دی۔ صبح اٹھ کر سیر کے لئے جانے لگا۔ کبھی کبھار سگریٹ پینے کا شوق تھا وہ بھی یکسر ختم کر دیا۔ وہ اپنی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں لانا چاہتا تھا اور ایک بدلا ہوا انسان بننا چاہتا تھا۔ زیادہ باوقار اور سلجھا ہوا نوجوان۔ اس نے تنہائی میں بیٹھ کر اپنی خامیوں اور کمزوریوں پر خوب غور کیا اور فیصلہ کیا کہ ان کمزوریوں کو دور کر کے رہے گا۔ اس کی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری شاید یہ بھی تھی کہ اس کے پاس "فارغ وقت" ہوتا تھا۔ اس فارغ وقت میں سارہ کی یاد اس پر حملہ آور ہوتی تھی اور کسی آکٹوپس کی طرح اسے اپنی گرفت میں جکڑ لیتی تھی۔ اس فارغ وقت سے چھٹکارا پانے کے لئے اس نے ایک کلب جوائن کر لیا۔ یہاں اسنوکر، سوئمنگ، بیڈمنٹن، اسکواش وغیرہ کی سہولتیں موجود تھیں۔ وہ رات گئے تک اس کلب میں مصروف رہنے لگا۔ محبوب کی ایک دوسری اور شاید سب سے اہم کمزوری یہ تھی کہ وہ بے حد کم گو تھا۔ جہاں دس الفاظ بولنے کی ضرورت ہوتی تھی وہاں ایک لفظ بول کر کام چلاتا تھا۔ اس کے ساتھی اس بات کو بری طرح محسوس کرتے تھے۔ محبوب نے اس خامی کو دور کرنے کی کوشش بھی شروع کر دی تھی۔ حالانکہ اسے یقین تھا وہ ناکام ہو گا۔ وہ جب سے راولپنڈی آیا تھا صرف تین مرتبہ لاہور گیا تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ جمعے کی شام کو لاہور پہنچا تھا اور رات گزارنے کے بعد علی الصباح چار بجے کی فلائنگ کوچ سے واپس آ گیا تھا۔ اہلِ خانہ معترض تھے لیکن وہ ان کا

اعتراض یہ کہہ کر دور کر دیتا تھا کہ کام بہت زیادہ ہے۔ اب پچھلے دو ڈھائی مہینے سے تو اس نے لاہور کا یہ برائے نام چکر بھی نہیں لگایا تھا بس فون پر ہی اہلِ خانہ کی خیر خیریت دریافت کر لیتا تھا۔ سارہ کے حالات کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا، ہاں کبھی کبھار قدیر کا خط راولپنڈی کے ایڈریس پر آ جاتا تھا۔ ان خطوں میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی۔ قدیر ایک کمپنی میں ملازم تھا، وہاں سے چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ وہ خود بھی زیادہ زور نہیں لگا رہا تھا۔ ابھی تو اس نے بمشکل وہ قرضہ ہی اتارا تھا جو اس کی ماں نے اسے دبئی بھیجنے کے سلسلے میں لیا تھا۔ اب وہ کچھ رقم جمع کرنا چاہتا تھا اور رقم جمع کرنا اس کے لئے اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ موج میلہ کرنے والا شخص تھا۔ یاری دوستی بھی کافی تھی۔ روپیہ پیسہ جیسے ہاتھ میں آتا تھا ویسے ہی نکل جاتا تھا۔ کسی کسی خط میں سارہ کا ذکر بھی ہوتا تھا۔ قدیر کے ساتھ سارہ کی خط و کتابت جاری تھی۔ اب قدیر کے خط سارہ کی ایک سہیلی کے ذریعے سارہ تک پہنچتے تھے۔ قدیر یہ خط کسی ہمراز سے لکھواتا تھا۔ کچھ دن پہلے قدیر نے بھی کیسٹ ارسال کی تھی۔ اس کیسٹ میں محبوب کا ذکر بھی تھا۔ سارہ نے قدیر سے بڑے اصرار کے ساتھ پوچھا تھا کہ محبوب کے ساتھ اس کی (قدیر کی) کوئی ناراضگی تو نہیں ہو گئی اور اگر ایسا نہیں تو پھر محبوب بھاہی جان اپنی صورت کیوں نہیں دکھاتے۔ کیوں بالکل اجنبی بن گئے ہیں۔ قدیر نے اپنی طرف سے اسے جواب ارسال کر دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ راولپنڈی میں بہت مصروف ہے اور خواہش کے باوجود لاہور آنے کے لئے وقت نہیں نکال پاتا۔ معلوم نہیں قدیر کے اس جواب نے سارہ کو مطمئن کیا تھا یا نہیں بہرحال اس سلسلے میں کوئی تازہ بات نہیں ہوئی تھی۔

وہ اوائل بہار کی ایک خوشبو سے لدی ہوئی رنگ دار شام تھی جب محبوب کو قدیر کا ایک چونکا دینے والا خط ملا۔ اس نے چھوٹتے ہی لکھا تھا۔ "یار تم کیسے دوست ہو۔ یہاں راولپنڈی میں آرام سے بیٹھے ہو اور وہاں لاہور میں سارہ مصیبت میں ہے۔"

تفصیل بتاتے ہوئے قدیر نے لکھا۔ "کوئی آوارہ قسم کا لڑکا ہے جو ہاتھ دھو کر سارہ کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ ٹویوٹا میں گھومتا ہے اور اس تاک میں رہتا ہے کہ سارہ گھر سے نکلے اور وہ اسے پریشان کرے۔ یہ بھی پتا چلا ہے کہ اس لڑکے کا تعلق تمہارے کالج سے ہے۔ سال ڈیڑھ سال پہلے تمہارے کالج میں کوئی ڈراما ہوا تھا اور ڈرامے کے دوران میں جھگڑا بھی ہو گیا تھا۔ سارہ کا خیال ہے کہ یہ لڑکا اسی ٹولے کا ہے جس سے جھگڑا ہوا تھا۔"

آگے جا کر قدیر نے لکھا تھا۔ "میرے یار! تمہارے ہوتے ہوئے مجھے کسی اور سے کہنا پڑے کہ وہ اس معاملے کو دیکھے تو بڑی شرم کی بات ہے۔ بے شک تم ملازمت اور پڑھائی میں بہت مصروف ہو اور تمہارے پاس کان کھجانے کی بھی فرصت نہیں مگر امید کرتا ہوں کہ تم کم از کم ایک بار لاہور ضرور جاؤ گے اور بات کو سلجھانے کی کوشش کرو گے۔ اس سلسلے میں میں نے اپنے اور تمہارے مشترکہ دوست جیدے کو بھی لکھا ہے۔ اس کا چچا زاد بھائی ایم این اے کا خاص بندہ ہے۔ وہ اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہے۔"

خط پڑھنے کے بعد محبوب سخت پریشان ہو گیا۔ بات تھی بھی پریشانی کی۔ جس معاملے کا ذکر قدیر نے خط میں کیا تھا اس کا براہ راست تعلق محبوب سے تھا۔ کالج کے آڈیٹوریم میں ہونے والے ہنگامے میں محبوب ہی کی وجہ سے سارہ نے ایک لڑکے کا گریبان پکڑا تھا۔ اس واقعے کو ایک برس سے اوپر گزر چکا تھا۔ محبوب کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ تنازعہ پھر سر اٹھالے گا۔

وہ اسی روز رات کو لاہور پہنچا۔ گھر والے اس کی غیر متوقع آمد سے حیران ہوئے اور خوش بھی۔ محبوب نے اپنی بڑی بہن راحت سے سن گن لینے کی کوشش کی لیکن اسے سارہ والے معاملے کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اگلے روز محبوب سارہ کے گھر گیا۔ ایک عرصے بعد اس نے سارہ کو اور سارہ نے اسے دیکھا۔ سارہ کے چہرے پر گلے شکوے نمایاں تھے۔ ویسے بھی وہ کچھ پژمردہ نظر آ رہی تھی۔ خالہ عطیہ نے بھی شکوے شکایات کی گٹھڑی کھول دی۔ "ارے تُو کیسا ہے محبوب! ایسی آنکھیں پھیریں کہ پھر ہماری خبر ہی نہیں لی۔ کیا غلطی ہو گئی تھی ہم سے۔"

محبوب شرم سے پانی پانی تھا' ہکلا کر بولا۔ "میں آپ دونوں سے بہت شرمندہ ہوں خالہ جی۔ راولپنڈی میں کام اتنا زیادہ ہے کہ کچھ نہ پوچھیں۔ میں تو ترس گیا ہوں لاہور آنے کے لئے۔"

خالہ عطیہ نے کہا۔ "یہ بات تو نہ کہو۔ اپنے گھر تو آتے جاتے ہی ہونا۔ چپکے سے آتے ہو' چپکے سے چلے جاتے ہو۔ جب بھی سارہ کو پتا چلتا ہے کہ تم آئے تھے اور ملے بغیر چلے گئے ہو تو کئی دن اداس رہتی ہے۔"

سارہ ناراضگی سے بولی۔ "چھوڑیں امی! جب ان کا دل ہی نہیں چاہتا ہم سے ملنے کو

تو ہمارے کہنے سننے سے کیا فرق پڑے گا۔"

محبوب نے بمشکل تھوک نگلا اور بولا۔ "سارہ! میں نے کہا ہے کہ میں بہت شرمندہ ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ.......... شروع کے تین چار مہینوں میں بہت زیادہ مصروفیت کی وجہ سے میں تمہارے ہاں نہ آسکا.......... اس کے بعد جھجک سی پیدا ہو گئی۔ سوچتا تھا کہ تمہاری ناراضگی کا سامنا کیسے کروں گا۔"

"ہم کون ہوتے ہیں ناراض ہونے والے آپ سے۔ ہمارا تعلق ہی کیا ہے۔" سارہ نے کہا اور خاموشی سے اندر چلی گئی۔ وہ بہت خفا تھی۔

خالہ عطیہ بولیں۔ "بیٹا! یہ بہت چاہتی ہے تمہیں۔ سچ پوچھو تو تمہارا نام لے لے کر جیتی ہے۔ جاؤ' ذرا اس کی دل جوئی کر دو۔"

محبوب اندر چلا گیا۔ وہ کمرے میں چارپائی پر بیٹھی تھی۔ گھٹنوں پر ایک ٹرے رکھی ہوئی تھی اور چاول چن رہی تھی۔ چہرہ اترا اترا نظر آتا تھا' حتیٰ کہ وہ پیشانی بھی جس کی چمک کبھی ماند نہیں پڑتی تھی۔ محبوب نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ کسی کو منانے کا ڈھنگ اسے کہاں آتا تھا۔ بس چند اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ یہ سارہ ہی کی مہربانی تھی کہ وہ ان بے اثر باتوں کا بھرم رکھتے ہوئے مان گئی۔ وہ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر محبوب اصل موضوع پر آ گیا۔ محبوب نے قدیر کے خط کا ذکر کیا اور سارہ سے اس لڑکے کے بارے میں پوچھا جو اسے پریشان کر رہا تھا۔ اس کا نام یاسر تھا۔ وہ اسی چنڈال چوکڑی کا رکن تھا جس سے ڈرامے کے دوران میں سارہ کا جھگڑا ہوا تھا۔ سارہ کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ لڑکا اکیلا نہیں بلکہ گروپ کے تین چار اور مسٹنڈے بھی اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔

سارہ کی باتیں سن کر محبوب کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ بہرحال اس نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ سارہ ڈری ڈری آواز میں بولی۔ "محبوب بھائی جان! میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ بات آپ تک پہنچاؤں لیکن ان کے حوصلے بڑھتے جا رہے تھے' اس لئے مجبور ہو گئی۔ اب بھی میں ہرگز یہ نہیں چاہوں گی کہ آپ ان سے کسی طرح کا جھگڑا کریں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ یاسر کا بڑا بھائی مشہور صحافی ناصر احمد ہے اور ناصر احمد' وقار انکل کا شاگرد رہا ہے۔"

"ابا جی کا شاگرد؟"

"ہاں جی۔ میرے خیال میں وقار انکل' ناصر احمد کو سمجھائیں تو وہ اپنے بھائی کو لگام ڈال لے گا۔"

محبوب نے کہا "ٹھیک ہے سارہ! تم بے فکر رہو۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا۔"

سارہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ یہ چمک چھپانے کے لئے اس نے پلکیں جھکالیں۔ محبوب کے سینے میں جوالا مکھی دہک اٹھا تھا۔ اسے ایک ایسی کیفیت کا احساس ہو رہا تھا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ بے حد خاموش طبع اور بزدلی کی حد تک امن پسند شخص تھا۔ بچپن میں وہ کسی سے جھگڑا ہو تو ہو ورنہ ایسا کوئی واقعہ اسے یاد نہیں تھا۔ کبھی کبھی تو اسے یہ سوچ کر کوفت ہوتی تھی کہ وہ جھگڑے سے بچنے کے لئے بعض اوقات اپنے حق سے بھی دستبردار ہو جاتا ہے لیکن کچھ بھی تھا یہ سب کچھ اس کے مزاج کا حصہ تھا اور وہ اسے تسلیم کر چکا تھا۔

مگر آج سارہ کے آنسو دیکھ کر اس نے جو کچھ محسوس کیا تھا' وہ بیان سے باہر تھا۔ یاسر کا چہرہ شیطانی مسکراہٹ لئے ہوئے بار بار اس کے تصور میں آرہا تھا اور اس کی رگوں میں آگ بھڑکا رہا تھا۔ اسے یہ بات کچھ جچی نہیں کہ وہ اپنے والد کے پاس جائے اور ان سے کہے کہ وہ اپنے شاگرد ناصر احمد سے ملیں اور اس سے درخواست کریں کہ وہ اپنے لوفر بھائی کو سمجھائے۔ یہ تو بڑا کمزور سا ردعمل تھا اور کیا معلوم کہ اس ردِعمل کا کوئی فائدہ بھی ہونا تھا یا نہیں۔ محبوب' یاسر کو کسی حد تک جانتا تھا۔ وہ شروع سے ہی ایک خود سر اور جھگڑالو لڑکا تھا۔ کالج میں اکثر لڑکے اس سے نالاں رہتے تھے مگر عزت بچانے کے لئے خاموشی اختیار کرتے تھے۔ یہ بات عین ممکن تھی کہ وہ اپنے بڑے بھائی کے سمجھانے بجھانے سے بھی باز نہ آتا۔

محبوب قریباً ساری رات اس بارے میں سوچتا رہا۔ سوچ سوچ کر اس کا وجود آگ کی طرح تپنے لگا تھا۔ اسے بخار تھا۔ اگلے روز صبح سویرے اس نے چھوٹے بھائی عاطف کی موٹر سائیکل پکڑی اور اچھرہ میں یاسر احمد کے گھر جا پہنچا۔ یاسر کے گھر کا پتا اسے اپنے ایک دوست سے مل گیا تھا۔ کال بیل کے جواب میں گھر کا دروازہ کھولنے والا یاسر ہی تھا۔ وہ محبوب کو پہلے تو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا' پھر اسے پہچان کر دنگ رہ گیا۔

"کک.......... کیا بات ہے؟" اس نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

محبوب کے چہرے پر نظر آنے والی ہیجانی کیفیت نے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں

اندیشے جگا دیئے تھے۔

محبوب نے کہا۔ "کیا گلی میں بات کرنا مناسب رہے گا؟"

یاسر چند لمحے کے لئے تذبذب میں رہا' پھر اس نے اندر جا کر گھر کی بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔

محبوب اندر داخل ہو گیا لیکن بیٹھا نہیں۔ اس کے سینے میں غم و غصے کا طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور اس طوفان کی شدت سے اس کا دھان پان جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

وہ یاسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "یاسر! میں تم سے لمبی چوڑی بات کرنے نہیں آیا' اور جو بات میں کرنے آیا ہوں اس کے بارے میں تم بھی جانتے ہو اور میں بھی۔ کیا خیال ہے؟"

محبوب کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ یاسر جو بڑے بڑے دبنگ لوگوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا' ہونٹوں پر زبان پھیرنے پر مجبور ہو گیا' ہکلا کر بولا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

محبوب کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی اور وہ سرتاپا لرز رہا تھا۔ عجیب سے خطرناک لہجے میں بولا۔ "میں آج تک کسی سے جھگڑا نہیں ہوں۔ شاید اونچی آواز میں بات بھی نہیں کی ہے لیکن میں ایک بات تمہیں بتا دوں' آج کے بعد تم نے یا تمہارے کسی چمچے نے سارہ کو تنگ کرنے کی کوشش کی تو میں تمہیں قتل کردوں گا.......... خدا کی قسم قتل کردوں گا۔"

یاسر کا چہرہ ایک دم زرد ہو گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے محبوب کی طرف دیکھ رہا تھا پھر اس کے ہونٹ لرزے اور وہ بولا۔ "یار.......... تت.......... تم کیسی بات کر رہے ہو' ہم نے ہمیشہ تمہاری عزت کی ہے' لیکن.........."

"بس.......... اور کچھ مت کہو۔" محبوب نے اس کی طرف انگلی اٹھائی۔ "جو میں نے کہنا تھا' کہہ دیا ہے۔ اس کے سوا ایک لفظ نہیں کہوں گا اور نہ کچھ سنوں گا۔"

وہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا اور موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا تھا۔

گھر واپس آکر بھی محبوب رات تک لرزتا رہا تھا۔ معلوم نہیں یہ کس جذبے نے سر اٹھایا تھا اس کے اندر' یہ کیسی طاقت ملی تھی اسے کہ اس نے یاسر جیسے غنڈے کو سہما

کر رکھ دیا تھا۔ فرائیڈ نے کہا تھا کہ ہر جذبے کا ماخذ مرد و زن کا باہمی تعلق ہے۔ تو کیا آج کچھ دیر کے لئے جو توانائی برقِ آسمانی کی طرح اس کے جسم میں کوندی تھی وہ اسی باہمی تعلق کا نتیجہ تھی .... یا پھر کوئی اور وجہ تھی کہ وہ زندگی میں پہلی بار اس طرح "جذباتی" ہوا تھا۔

نہ جانے کیوں اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ یاسر سے ہونے والی آج کی ملاقات یاسر کے لئے بے حد متاثر کن رہی ہے.......... اور اب سارہ کی جان اس مصیبت سے قریباً قریباً چھوٹ جائے گی۔

ساری رات اس کا جسم آگ کی طرح تپتا رہا۔ شاید یہ حرارت اس ہیجانی کیفیت کا نتیجہ تھی جو کل رات بھر اس پر طاری رہی تھی۔ اگلے روز نو دس بجے کے لگ بھگ وہ دوبارہ سارہ کے گھر گیا۔ اسے تسلی تشفی دی۔ بتایا کہ اس نے یاسر کو سمجھایا ہے' اور اسے امید ہے کہ اب وہ اس کا پیچھا چھوڑ دے گا۔ اس روز محبوب نے سارہ سے دیر تک باتیں کیں۔ وہ ساری باتیں جو پچھلے کئی ماہ سے ان دونوں کے دلوں میں جمع ہو چکی تھیں۔ ان باتوں میں کئی بار قدیر کا ذکر بھی آیا۔ کہتے ہیں کہ دوری محبت کی تپش کو بڑھا دیتی ہے یا ختم کر دیتی ہے۔ محبوب اندازہ لگانے میں ناکام رہا۔ بس وہ محبت کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کو خط لکھ رہے تھے۔ مستقبل کی باتیں کر رہے تھے کبھی کبھی قدیر' سارہ کو کوئی تحفہ بھی پارسل کر دیتا تھا۔ ان کا تعلق بس چل رہا تھا۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ سارہ کے حوالے سے اپنی "غیر معمولی محبت" کے مقابلے میں محبوب کو یہ محبت بالکل معمولی اور ہیچ نظر آئی۔

باتوں باتوں میں محبوب کو یہ معلوم ہوا کہ سارہ کے بی اے کے امتحان سر پر ہیں اور صرف چھ روز بعد اس کا پہلا پیپر ہے۔ سارہ کی باتوں سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ چند مضامین کی طرف سے پریشان ہے اور ان مضامین کی تیاری میں اسے مشکل پیش آ رہی ہے۔ سارہ نے زبان سے تو نہیں کہا لیکن صورت حال سے یہی پتا چل رہا تھا کہ اسے فائنل تیاری میں رہنمائی کی شدید ضرورت ہے۔ اس موقع پر پہلو بچانا محبوب کو کسی طور بھی مناسب نظر نہیں آیا' ویسے بھی اس کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ اس نے راولپنڈی چھٹی کی درخواست بھیج دی۔ یہ چھٹی ایک ماہ کے لئے تھی۔

محبوب سارہ کے قریب رہنا نہیں چاہتا تھا لیکن حالات اسے گھیر کر ایک بار پھر سے

گلی میں لے آئے تھے۔ وہی راستے وہی منزلیں' وہی دھوپ چھاؤں' وہی گھروں کے سامنے پختہ تھڑوں پر کھیلتے ہوئے بچے اور نیم تاریک ڈیوڑھیوں میں سرگوشیاں کرتی عورتیں۔ یہ گلی دو جگہ آباد تھی۔ ایک زمین پر اور ایک محبوب کے دل میں.......... اور وہ بہار کا موسم تھا' جب آسمان پر پتنگیں لہراتی ہیں' ہوا خوشبو سے بوجھل ہو کر چلتی ہے' شامیں رنگین ہو جاتی ہیں اور ہر سینے میں ایک شگوفہ کھل اٹھتا ہے۔ محبوب ایک بار پھر سارہ کو پڑھانے جانے لگا۔ سارہ کی کشش اور نکھار میں کچھ اور اضافہ ہو چکا تھا' یا شاید محبوب کی اپنی نظر میں ہی پسندیدگی بڑھ گئی تھی۔ سارہ کی قربت اسے مدہوش کر دیتی تھی لیکن اس مدہوشی میں ایک خوف بھی شامل ہوتا تھا۔ کہیں سارہ اس کی کیفیت کو بھانپ نہ لے۔ کہیں اس کے دل و دماغ میں تہلکہ مچانے والی سوچیں ہوا کی لہروں پر سفر کر کے سارہ کے ذہن تک نہ پہنچ جائیں۔ وہ انوکھے تذبذب کا شکار تھا۔ ایک ہی وقت میں سارہ کے پاس جانا بھی چاہتا تھا اور اس سے دور بھی بھاگنا چاہتا تھا۔ یہ کون سا جذبہ تھا؟

اس کی طبیعت بدستور خراب تھی۔ کبھی بخار اتر جاتا تھا' وہ خود کو بہتر محسوس کرتا تھا لیکن دوسرے روز پھر بدن تپنے لگتا تھا۔ بخار کے باوجود وہ سارہ کو پڑھانے بھی چلا جاتا تھا۔ سارہ کی قربت اس کی دھڑکنوں کو زیر و زبر کر دیتی۔ جب تک وہ اس کے قریب رہتا ایک سنسناہٹ رگ و پے میں دوڑتی رہتی۔ اس کا دل چاہتا وہ جلد از جلد فارغ ہو جائے اور گھر واپس چلا جائے لیکن گھر واپس پہنچ کر سارہ کا چہرہ پوری آب و تاب سے اس کے تصور میں چمکنے لگتا۔ اس کی کھنکتی آواز اس کے کانوں میں گونجتی۔ اس کی اداؤں کی سادگی محبوب کو کچوکے لگانے لگتی۔ وہ بے حال ہو جاتا۔ راولپنڈی سے لاہور آ کر وہ شب و روز مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ایک روز اس کے ذہن میں ایک عجیب خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ وہ اپنی اندرونی کیفیات کو جس قدر چھپانے کی کوشش کر رہا ہے اتنا ہی اذیت میں مبتلا ہو رہا ہے۔ کیوں نہ وہ ایسا کرے کہ ایک ہی بار ساری اذیت جھیل لے۔ ایک ہی بار اپنی جان پر ستم اٹھا کر اس سچ کو قبول کر لے جو ایک مدت سے اس کا جینا حرام کر رہا ہے۔ وہ سارہ کے سامنے جا کر اعتراف کر لے کہ وہ اس محبوب سے بہت مختلف ہے: جس کا بت اس نے اپنے من مندر میں سجا رکھا ہے۔ اس کی جو صفات اس نے اپنے "مضمون" میں لکھی تھیں' ان میں سے شاید ایک بھی اس کے اندر نہیں ہے۔ نہ سنجیدگی' متانت اور بردباری اس کا شعار ہے۔ نہ نیکی اور پارسائی اس کے کردار کے جزو

ہیں۔ نہ اس کی شخصیت اس شیشے کی طرح صاف شفاف ہے جس کے آر پار سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ تو بے حد دھندلا اور ناقابل فہم ہے اتنا دھندلا کہ خود بھی مشکل سے پہچانتا ہے۔ وہ تو ایک بالکل معمولی شخص ہے جس کا دل دنیاوی آلائشوں اور خواہشات کے کیچڑ میں لتھڑا ہوا ہے۔ اس کی قابل ملامت اور شرمناک خواہشات میں سے ایک خواہش یہ بھی ہے کہ وہ اسے چاہتا ہے۔ اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس کے دوست سے محبت کرتی ہے۔ اس کے دوست کا خواب ہے.......... یہ سب کچھ بتانے کے بعد وہ سارہ کا ردعمل دیکھنے کی زحمت بھی نہ کرے اور واپس آجائے۔ کبھی دوبارہ اسے اپنی شکل نہ دکھانے کے لئے اور یوں وہ افسانہ جسے انجام تک لانا ممکن نہیں' اسے ایک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑ دیا جائے۔

اس کے دل میں ارادے کی ایک بلند لہر اٹھی اور وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ پتا نہیں کیسے اس کے قدم سارہ کے گھر کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ قریباً یہی وقت ہوتا تھا جب وہ اسے پڑھانے جاتا تھا لیکن آج وہ کچھ پہلے چلا آیا تھا۔ سارہ اپنے کمرے میں تھی۔ سویٹر بُن رہی تھی۔ محبوب کو دیکھ کر ایک دم کھڑی ہو گئی۔ وال کلاک دیکھ کر بولی۔ "آج آپ کچھ جلدی نہیں آگئے!؟"

"ہاں آج میں تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"زہے نصیب کہ آج آپ نے مجھ سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔" وہ خوش ہو کر بولی۔

محبوب نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر دی۔ دروازہ ڈور کلوزر کی وجہ سے خود ہی بند ہو گیا تھا۔ محبوب کے تاثرات دیکھ کر سارہ ذرا سی ٹھٹکی لیکن پریشان بالکل نہیں ہوئی۔

"کوئی خاص بات لگتی ہے۔" وہ سر پر اوڑھنی درست کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں سارہ.......... بہت خاص بات۔" محبوب کی آواز لرز رہی تھی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" سارہ کے لہجے میں ہلکی سی پریشانی آگئی۔

"ہاں بالکل ٹھیک ہوں۔" محبوب نے کہا۔ اس کا دل سینے میں ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ زبان کی جگہ چمڑے کا ایک خشک ٹکڑا ہے جو ہزار کوشش کے باوجود بھی حرکت نہیں کرے گا۔ "بات دراصل یہ ہے سارہ کہ.........." آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔

ایک پھندا سا لگ گیا۔

وہ کوشش کے باوجود اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکا۔ چند لمحے سکتے کی سی حالت میں وہاں کھڑا رہا پھر اس نے بات کو مختلف انداز میں کہنے کے لئے اپنے ذہن میں الفاظ کی ترتیب بدلی۔ ایک بار پھر ہمت جمع کی اور بولنے کے لئے لبوں کو حرکت دی لیکن اسی دوران میں سارہ کی چھوٹی بہن شاہین کی آواز آگئی۔ "باجی سارہ! کہاں ہیں آپ؟ امی چھت پر بلا رہی ہیں۔"

سارہ ٹھٹک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ محبوب نے سر کو عجیب سے انداز میں جھٹکا اور دروازے کی طرف گھوم گیا۔ چند ہی لمحے بعد وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا سارہ کے گھر سے باہر نکل رہا تھا.......... ایک بار پھر وہ اپنے دل کی بات زبان پر لانے میں ناکام رہا تھا.......... ایک بار پھر اس نے دیر کر دی تھی۔ یہ "دیر" اس کے شب و روز میں یوں سرایت کر چکی تھی اس کی زندگی کا ہی ایک حصہ بن گئی تھی۔

اگلے روز وہ سارہ کو پڑھانے گیا۔ سارہ بار بار پوچھتی رہی۔ "بھائی جان! کیا بات تھی جو آپ کہنا چاہ رہے تھے؟"

"پھر کسی وقت بتاؤں گا۔" وہ بار بار یہی جواب دے رہا تھا۔

"کک.......... کہیں شہلا باجی کے بارے میں تو کوئی بات نہیں تھی؟" وہ شوخ لہجے میں بولی۔

"پھر وہی شہلا۔" وہ قدرے غصے سے بولا۔ "تم اسے بار بار کیوں گھسیٹ لیتی ہو اپنی باتوں میں۔ کیا میری زندگی صرف شہلا کے گرد ہی گھومتی ہے۔"

"افوہ' آپ تو ناراض ہو گئے۔ اچھا معاف کر دیجئے۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے' کتابیں کھولو۔"

"آپ کی ناراضگی دور نہیں ہوئی۔" وہ ادا سے بولی۔ "ٹھیک ہے جناب! اب آپ سے نہیں پوچھوں گی کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے تھے۔ اوکے؟" اس نے ہاتھ جوڑے۔

"یس اوکے۔"

وہ پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔ دوسرے روز سارہ کا پہلا پیپر تھا۔ پیپر بھی انگلش کا تھا۔ عام طور پر محبوب شام سات آٹھ بجے واپس آجاتا تھا لیکن اس روز وہ دیر تک پڑھاتا رہا۔ سارہ بھی بڑی توجہ سے پڑھتی رہی۔ وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ رات کے دس بج

گئے۔ بے احتیاطی سے محبوب کا بخار بگڑا ہوا تھا اور وقفے وقفے سے حرارت ہو جاتی تھی۔

آج دو تین دن بعد وہ پھر حرارت محسوس کر رہا تھا لیکن سارہ پر کچھ ظاہر کئے بغیر وہ اسے تیاری کرواتا رہا۔ سارہ کی بہنیں اپنے والد کے ساتھ کسی شادی میں سیالکوٹ گئی ہوئی تھیں۔ بس خالہ عطیہ گھر میں تھیں۔ سارہ کے امتحان تھے۔ اس کے ساتھ کسی کو تو گھر میں رہنا ہی تھا۔ نو بجے کے قریب خالہ سونے کے لئے لیٹ گئی تھیں۔ بہرحال وقفے وقفے سے ان کی کھانسی کی آواز آجاتی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بستر پر جانے کے باوجود جاگ رہی ہیں۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے محبوب تھک سا گیا تھا۔ وہ اب گھر جانا چاہ رہا تھا لیکن سارہ کا آخری مضمون مکمل ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ "کتنی دیر ہے بھئی؟"

"بس پانچ منٹ بھابی جان۔" اس نے نوٹ بک پر جھکے جھکے جواب دیا۔

اس کی ایک لٹ ڈھلک کر نوٹ بک کو چھو رہی تھی۔ لمبی گردن کا خم قابل دید تھا۔

محبوب کمر سیدھی کرنے کے لئے آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ چند منٹ بعد سارہ نے مضمون مکمل کر لیا۔ نوٹ بک محبوب کو تھمانے کے لئے اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ دونوں کے ہاتھ چھو گئے۔ سارہ نے چونک کر محبوب کا ہاتھ تھاما۔ "آپ کو تو بخار ہے۔"

"ہاں کچھ حرارت سی ہے۔"

"حرارت نہیں جناب۔ اچھا بھلا بخار ہے۔" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

اس نے لپک کر الماری میں سے تھرما میٹر نکالا اور محبوب کے منہ میں دے دیا۔ بخار 102 سے زیادہ تھا۔ وہ محبوب پر ناراض ہونے لگی کہ اتنے بخار کے باوجود اس نے بتایا کیوں نہیں۔ محبوب اٹھنا چاہ رہا تھا لیکن وہ بولی۔ "لیٹے رہیں۔ میں آپ کا سر دبا دوں۔"

سارہ کے ٹھنڈے نرم ہاتھ محبوب کی تپتی پیشانی پر آئے تو بقول شاعر، روح تک آگئی تاثیر مسیحائی کی۔ وہ مبہوت سارہ گیا۔ دو تین منٹ بعد جب وہ اٹھنا ہی چاہ رہا تھا ایک دم لائٹ چلی گئی۔ کمرے میں اور کمرے سے باہر اور دور تک گھپ اندھیرا چھا گیا۔

"اوہ۔" سارہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اس کے ہاتھ بدستور محبوب کی پیشانی پر حرکت کر رہے تھے۔

چند سیکنڈ بعد وہ بولی۔ "میں موم بتی لے آؤں۔"

"نہیں رہنے دو۔" نہ جانے کیسے محبوب کے ہونٹوں سے نکل گیا۔

کمرے میں چند لمحے بے ڈھنگی سی خاموشی رہی پھر محبوب نے وضاحت کرتے

ہوئے کہا۔ "ابھی آجاتی ہے لائٹ۔ خواہ مخواہ کہیں ٹھوکر لگے گی۔"

سارہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ تاریکی محبوب کے لئے بڑی سازگار تھی۔ وہ جو بات کل نہیں کہہ سکا تھا وہ آج اس تاریکی میں کہہ سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس کے بدن میں سنسنی کی تیز لہر دوڑ گئی۔ اس نے الفاظ منتخب کئے اور فقرے کو ترتیب دینے لگا لیکن ایک بار پھر وہی کم ہمتی اچانک اس پر طاری ہو گئی جس نے کل اسے دبوچا تھا۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ وہ یہ بات کبھی بھی باوقار انداز اور لب و لہجے میں سارہ تک نہیں پہنچا سکے گا اور بے وقار ہونا اسے قبول نہیں تھا۔ ایک دم ہی تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے ہو گئے اور اس نے تاریکی کو مزید گہرا کرنے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ سارہ کے ہاتھ پیشانی پر متحرک تھے۔ کبھی کبھی کوئی چوڑی ہولے سے کھنک جاتی تھی۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "میری الماری میں ڈسپرین موجود ہے۔ آپ کہیں تو لادوں۔"

"نہیں، رہنے دو۔" محبوب نے کہا۔

اس کا دل ایک بار پھر عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ بدن میں کوئی شعلہ بھڑک اٹھا تھا۔ اس کی زبان کو بولنے کی سکت نہیں تھی لیکن اُس کے ہاتھ کو حرکت میں آنے کی سکت تھی۔ اس کا ہاتھ حرکت میں آیا اور عام سے انداز میں سارہ کے بازو سے مس ہو گیا۔ بالکل جیسے محبوب کو خود بھی خبر نہ ہو کہ اس کا ہاتھ سارہ کے بازو سے چھو رہا ہے۔ وہ اس معمولی سے لمس کی ہر تفصیل جانتا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پشت کا چھوٹی انگلی والا حصہ سارہ کے بازو پر کہنی سے ذرا نیچے چھو رہا تھا۔ وہ نصف آستین پہنے ہوئے تھی لہٰذا بازو ننگا تھا۔ یہ ایک غیر اہم سا لمس تھا لیکن اس کی قدر و قیمت صرف اور صرف محبوب جانتا تھا۔ قریباً دو منٹ اسی طرح گزرے پھر اس ہاتھ نے دوبارہ حرکت کی اور آہستگی سے سارہ کے بازو پر رینگ گیا۔ اب ہاتھ نے کروٹ لے لی تھی اور اس کی ہتھیلی سارہ کے بازو پر تھی۔ جو بات زبان سے ادا نہیں ہو سکتی تھی اسے "ہاتھ" بیان کرنے کی کوشش کر رہا تھا' سارہ کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ کم از کم محبوب کو محسوس نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں کے درمیان تاریکی کا پردہ تھا۔ تاریکی جو صدیوں سے بھید چھپاتی آئی ہے۔

کچھ دیر بازو پر رہنے کے بعد محبوب کا ہاتھ سارہ کے شانے پر آگیا۔ وہ خاموش تھی

اور یہ خاموشی بڑی تباہ کن تھی۔ محبوب کے بدن میں ہزاروں سورج طلوع ہو گئے تھے اور ان کی حرارت اسے پگھلاتی چلی جا رہی تھی۔

"کیا.......... بات ہے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا.........." سارہ کی مدھم آواز ابھری۔

محبوب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب "دینے کے بجائے" جواب "نہ دینا" اسے بہت اچھا لگا۔ اس خاموشی میں ایک طوفان' ایک ہیجان تھا۔ ہزاروں سورجوں کی حرارت خون کو لاوے کی طرح کھولا رہی تھی۔ اس کا ہاتھ اس کے شانے پر پڑا رہا' دھیرے دھیرے حرکت کرتا رہا' اس کی شفاف گردن سے چھونے لگا۔

لائٹ گئے قریباً پانچ چھ منٹ گزر چکے تھے۔ قریبی کمرے سے سارہ کی والدہ کی آواز آئی "کیا بات ہے سارہ! موم بتی نہیں جلائی؟"

"ڈ.......... ڈھونڈ رہی ہوں امی۔ مل نہیں رہی۔" سارہ نے کہا اور یونہی ٹیبل لیمپ کو اِدھر سے اُدھر کیا۔ محبوب کا ہاتھ بدستور اس کے شانے پر تھا۔ محبوب کی کہنی کسی گداز سے چھو رہی تھی۔ ایک دم محبوب کے لئے وہ بات کہنا آسان ہو گئی جو "ہاتھ کی حرکت" سے پہلے کہنی بے حد.......... بے حد مشکل تھی۔ اس نے اپنی تمام جسمانی اور ذہنی قوت کو ایک نقطے پر مرکوز کیا اور آنسوؤں سے بوجھل ایک ناقابلِ شناخت آواز میں بولا۔ "آئی لو.......... یُو.......... سارہ۔"

ایک دم جیسے کوئی ہزاروں لاکھوں قمقموں والا فانوس آسمان سے گرا اور سنگلاخ زمین سے ٹکرا کر زبردست چھناکے سے چکنا چُور ہو گیا۔ اس چھناکے کی گونج سینکڑوں میل کے دائرے میں پھیلتی اور گونجتی محسوس ہوئی۔ ان لمحوں میں وقت بھی جیسے تھم گیا تھا۔

"یہ لو۔ یہ رہی موم بتی۔" خالہ عطیہ کی آواز برآمدے کی طرف سے آئی۔

سارہ کے جسم میں جھرجھری سی نمودار ہوئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ محبوب کا ہاتھ اس کے شانے پر سے پھسل گیا۔ وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ چند لمحے بعد کمرے میں روشنی کی کرنیں نمودار ہوئیں۔ موم بتی کارنس پر روشن ہو گئی۔ محبوب نے اپنا بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔ اس بازو کی اوٹ سے اس نے سارہ کو دیکھا۔ شمع کی روشنی میں اس کا چہرہ سرخ ہو کر تمتما رہا تھا لیکن وہ بالکل خاموش تھی۔ ایسی خاموشی محبوب نے اس

کے چہرے پر پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ توقع کرتا رہا کہ وہ کچھ کہے گی لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ باہر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید تیز ہوا چل رہی تھی۔ شاید آندھی آ گئی تھی۔ یہ لائٹ غالباً آندھی کی آمد کے سبب ہی گئی تھی۔ اچانک کمرے کی دو بند کھڑکیاں ایک دھماکے سے کھلیں اور ہوا کے تیز جھونکے سرکش گھوڑوں کی طرح کمرے میں چکرا گئے۔ موم بتی بجھ گئی۔ ایک بار پھر گہری تاریکی چھا گئی۔ محبوب کھڑکی بند کرنے کے لئے بڑھا۔ شاید اسی وقت سارہ بھی کھڑکی کی طرف بڑھی تھی۔ دونوں ٹکرا گئے۔ سارہ جھجک کر پیچھے ہٹی لیکن محبوب کے ہاتھ اس کے شانوں پر تھے۔ اس نے سارہ کو روک لیا۔ اس میں اتنی جرأت نہ جانے کہاں سے آ گئی تھی یا پھر شاید یہ "تاریکی کی جرأت" تھی۔

"آئی لو یُو سارہ۔" اس نے ایک بار پھر بےباک سرگوشی کی اور اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ بری طرح کسمسائی۔

"نہ کریں.......... چھوڑ دیں مجھے۔"

لیکن محبوب کی گرفت مضبوط تھی۔ اس گرفت میں محبت بھرا جوش لہریں لے رہا تھا۔ اس نے بے ساختہ اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیئے۔ اس کے رخساروں پر رکھ دیئے۔ "چھوڑ دیں پلیز.......... پیچھے ہٹ جائیں۔" وہ کراہ رہی تھی۔

شاید وہ زیادہ بلند آواز سے بولتی۔ شاید وہ زیادہ شدید مزاحمت کرتی لیکن خالہ عطیہ برآمدے میں تھیں۔ سارہ کی آواز ان کے کانوں تک پہنچ سکتی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ آواز ان تک پہنچے۔ اس کی پشت دیوار سے لگ گئی تھی اور جسم محبوب کی بانہوں میں تھا۔ وہ اسے دیوانہ وار چوم رہا تھا' بھینچ رہا تھا۔ وہ رونے لگی تھی۔ اس کے گلے میں جیسے پھندا سا لگ گیا تھا۔ بولنا چاہ رہی تھی لیکن بول نہیں پا رہی تھی۔ گاہے گاہے اس کے ہونٹوں سے سسکی نکلتی تھی۔ "پلیز چھوڑ دیں۔ پلیز.......... چھوڑ دیں مجھے۔"

وہ اسے خوب چوم چکا تو اس کے بال اپنی مٹھی میں لئے اور اس کا چہرہ آہستگی سے اوپر کی طرف اٹھا دیا۔ وہ کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا۔ اپنے دل کی کیفیت بیان کرنا چاہ رہا تھا لیکن الفاظ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ کوئی جملہ ہی نہیں بن پا رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر صرف اتنا ہی کہہ سکا "آئی لو یُو" اور آہستگی سے اسے چھوڑ دیا۔ چند قدم پیچھے ہٹ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ گہری تاریکی اس کا پردہ بنی ہوئی تھی۔ وہ اس پردے کی اوٹ

میں سارہ کے گھر سے نکلا اور گلی میں آ گیا۔ اس کے قدم تیزی سے اپنے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے۔

☆==========☆==========☆

جو کچھ ہوا وہ خواب و خیال جیسا تھا۔ محبوب کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو گا۔ وہ جو کسی لڑکی سے بات کرتے ہوئے پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے یوں جارحانہ انداز میں اس لڑکی سے اظہار محبت کرے گا جو اس سے ایسے اقدام کا تصور تک نہیں کر سکتی۔ جس نے اسے عزت و تکریم کے بلند و بالا درجے پر فائز کر رکھا ہے اور جو محبوب کے لئے قابلِ صد احترام ہے۔

محبوب نے گھر آنے کے بعد کمرا بند کیا اور سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھ گیا۔ اس کا سارا جسم شدت سے لرز رہا تھا۔ یقیناً یہ بخار کا لرزہ نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد گلی کوچوں میں آندھی کا زور ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی محبوب کے اندر چلنے والی آندھی بھی تھم گئی۔ جونہی یہ آندھی تھمی، اس پر ندامت اور پچھتاوے کا شدید ترین دورہ پڑ گیا۔ یہ اس نے کیا کیا تھا۔ وہ عرقِ ندامت میں ڈوب ڈوب جانے لگا۔ سارہ اور خالہ عطیہ اسے کیا سمجھتی رہی تھیں اور وہ کیا نکلا تھا۔ وہ آسمان کے تارے سے نالی کا کنکر بن گیا تھا اور پھر اچانک ایک اور چہرہ اس کے تصور میں آیا۔ وہ چہرہ جو نہ جانے کیوں پچھلے چند روز سے اس کی نگاہوں سے بالکل اوجھل تھا۔ بالکل بھولا ہوا تھا۔ وہ قدیر کا چہرہ تھا۔ قدیر جو اس کا پیارا دوست تھا۔ جس نے دبئی جاتے وقت کہا تھا۔ "شہزادے! سارہ کا خیال رکھنا۔"

یہ کیسا "خیال" رکھا تھا اس نے.......... یہ کیسی دوستی نبھائی تھی؟ وہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ گیا۔ نہایت کرب کے عالم میں اس نے دیوار پر مکے برسائے اور اپنے بال نوچ لئے۔ اس کا جی چاہا اپنی جان لے لے۔ وہ صوفے پر اوندھا گر گیا اور سسکنے لگا۔ گرم آنسو دھاروں کی صورت بہہ نکلے اور اس کا بازو بھگونے لگے۔ وہ کس آزمائش سے دوچار ہو گیا تھا۔ ایک طرف قدیر کی دوستی تھی اور دوسری طرف سارہ کی جان لیوا محبت۔ وہ تصور ہی تصور میں قدیر سے مخاطب ہوا۔ "مجھے کیوں یہاں بھیجا تھا تم نے؟ کیوں فرمائش کی تھی لاہور آنے کی پڑا رہنے دیا ہوتا مجھے وہیں.......... کاٹنے دی ہوتی قیدِ بامشقت۔ میں کہاں تھا اس قابل کہ پھر سارہ سے ملتا۔ یہ سب تمہارا قصور ہے۔ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔" وہ بہت دیر روتا رہا اور دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن

بوجھ ہلکا ہونے کے بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔ پچھتاوا کم ہونے کے بجائے شدید تر ہو رہا تھا۔ اس نے وہیں لیٹے لیٹے فیصلہ کیا کہ آج رات ہی لاہور سے چلا جائے گا اور یہ فیصلہ بھی کیا کہ آئندہ وہ کبھی سارہ کی اور خالہ عطیہ کی صورت نہیں دیکھے گا۔

رات کے آخری پہر اس نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا دیا۔ صرف بڑی بہن راحت کو جگا کر بتایا کہ راولپنڈی سے فون آیا ہے۔ اس کا راولپنڈی پہنچنا اشد ضروری ہو گیا ہے۔ وہ صبح چار بجے والی فلائنگ کوچ سے راولپنڈی جا رہا ہے۔ راولپنڈی پہنچ کر محبوب خود کو کارِ روز و شب میں گم کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ ایک ایسی اتھل پتھل جاری تھی اس کے اندر جس کو وہ کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ اس اتھل پتھل میں کئی طرح کے کرب شامل تھے۔ اہلِ خانہ سے دوری کا کرب، اپنی محبوب کی گلی سے دوری کا کرب، تاہم ان میں سب سے نمایاں کرب کا تعلق پچھتاوے سے تھا۔ یہ پچھتاوا ایک آسیب کی طرح ہر گھڑی محبوب سے چمٹا رہتا تھا۔ وہ قدیر کو کیا منہ دکھائے گا کس طرح اس کی سوالیہ نظروں کا سامنا کرے گا۔ اس پچھتاوے نے محبوب کا دل ہر چیز سے اچاٹ کر دیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دنیا نہیں چھوڑ سکتا تو کم از کم پاکستان ضرور چھوڑ دے۔ دور چلا جائے اس ملک سے جہاں وہ کسی بھی وقت سارہ اور قدیر کے چہرے دیکھ سکتا تھا۔ اب اس میں اتنی تاب نہیں تھی کہ ان سے مل سکتا۔ ان کی دید میں محبوب کے لئے بد ترین ذلتیں پوشیدہ تھیں۔ اس نے پاسپورٹ بنوالیا تھا اور اوورسیز جاب کے لئے کوششیں کر رہا تھا۔ کمپیوٹر میں اب اس کے پاس ہائی کوالیفکیشن تھی، قریباً دو سال کا تجربہ بھی ہو چکا تھا لیکن اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ اس میں "پی آر" کی زبردست کمی تھی۔ شاید وہ تیز طرار لوگوں سے بھری ہوئی اس دنیا کا فرد ہی نہیں تھا۔ اسے ملازمت کے لئے انٹرویو دینے سے نفرت تھی اور شاید "انٹرویو" کو بھی اس سے نفرت تھی۔ اس "انٹرویو" نے کبھی بھی اسے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ ملازمت کے لئے انٹرویو دینے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اپنے اندر موجود صفات اور کمالات کے بارے میں بتایا جائے، لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ہمیشہ ناکام ہوا تھا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کی خاموشی ہی اس کے حق میں بہتر ہے۔ اب اس نے اپنی صفات تلاش کرنے کا کام دوسروں پر چھوڑ دیا تھا اور اپنی تمام تر توجہ اس بات پر مرکوز کر دی تھی کہ اس کے اندر نمایاں صفات پیدا ہو جائیں۔ اتنی نمایاں کہ اس کی بے زبانی کے باوجود چھپی نہ رہ سکیں۔ غالباً وہ اپنی کوشش

میں کسی حد تک کامیاب ہوا تھا۔ سعودیہ میں اسے کمپیوٹر پروگرامنگ کی اچھی جاب مل گئی تھی۔ تنخواہ بھی توقع سے کم نہیں تھی۔ وہ تین مہینے بعد پہلی بار راولپنڈی سے لاہور آیا۔ وہ رات کے وقت آیا تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ وہ لاہور میں ہے۔ اس نے ماں باپ اور بہن سے سعودیہ جانے کی اجازت چاہی۔ اجازت لینے میں تھوڑی سی دشواری پیش آئی لیکن ناکامی نہیں ہوئی۔ ساٹھ ستر ہزار پاکستانی روپے ماہوار مل رہے تھے۔ ترقی کے مواقع بھی تھے۔ اہل خانہ سے اجازت حاصل کر کے وہ راتوں رات ہی راولپنڈی واپس چلا گیا تھا۔ چند روز بعد اس کی سعودیہ روانگی بھی راولپنڈی سے ہی ہوئی تھی۔ وہ ہوا کے دوش پر سوار ہوا تھا اور ایک دور افتادہ منزل کی طرف پرواز کر گیا تھا۔

☆==========☆==========☆

نیا ملک' نیا ماحول' نئے ساتھی اور توجہ طلب مصروفیات۔ کم آمیز اور تنہائی پسند ہونے کے باوجود محبوب کے شب و روز میں نمایاں تبدیلی آگئی۔ نئی فضا میں پہنچ کر اسے سکون سا آگیا تھا۔ جیسے کوئی جلتے تپتے صحرا سے نکل کر درختوں کی پناہ میں آجائے' یا لُو کے تھپیڑے بارش کی بوچھاڑوں میں بدل جائیں۔ اس نے ایک خاص احتیاط یہ کی تھی کہ اپنا ایڈریس کسی کو نہیں بتایا تھا۔ صرف والد' والدہ اور بڑی بہن راحت کو اس ایڈریس کا علم تھا۔ محبوب نے انہیں تاکید کر دی تھی کہ وہ یہ ایڈریس صرف اپنے تک رکھیں۔

لاہور کی اس طوفانی رات کو پیش آنے والے واقعے کی یاد دھیرے دھیرے اپنی شدت کھونے لگی۔ قدیر اور سارہ کے چہرے پردہ تصور پر کم کم نمودار ہونے لگے۔ ہاں جب کبھی فرصت ہوتی اور وہ بستر پر دراز ہوتا تو یہ ساری یادیں ایک دم اجاگر ہو جاتیں اور ایک جری لشکر کی طرح ہلہ بول کر اس پر حملہ آور ہو جاتیں۔ آنکھوں کے سامنے مناظر ابھرتے اور پھر ان مناظر سے وابستہ سوال ذہن پر ہتھوڑے برسانے لگتے۔ وہ سوچتا۔

"اس واقعے کے بعد سارہ کا رد عمل کیا تھا۔ اس نے خالہ عطیہ کو بتایا تھا یا نہیں.......... اس نے قدیر کو آگاہ کیا تھا یا نہیں۔ اگر آگاہ کیا تھا تو قدیر کا رد عمل کیا تھا' خالہ عطیہ کا رد عمل کیا تھا۔ قدیر نے کیا سوچا تھا۔ اگر قدیر سے اس کی ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کیا کہتا؟" پھر ایک اور سوچ اسے الجھن کے خار زار میں گھسیٹنے لگتی۔ اس طوفانی رات کو تاریک کمرے کا تاریک نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے آتا۔ اسے یاد آتا کہ اس نے کس طرح سارہ کو اپنی بانہوں میں لیا تھا۔ کیسے دیوانہ وار اس پر جھک گیا تھا۔ اسے سارہ کی

مزاحمت یاد آئی۔ محبوب کے رویے کے مقابلے میں سارہ کی مزاحمت نہ ہونے کے برابر تھی۔ منطقی طور پر یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ پوری شدت سے اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کرتی اور نہ چھڑا سکتی تو بلند آواز میں بولتی یا پھر والدہ کو مدد کے لئے پکارتی اور اگر وہ اس کے منہ پر طمانچے بھی رسید کر دیتی تو یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی لیکن وہ صرف کسمساتی رہی تھی یا دبی دبی آواز میں احتجاج کرتی رہی تھی۔ کیا وہ محبوب کو اتنی ہی عزت دیتی تھی کہ اس کے نہایت غلط سلوک کے باوجود خاموش رہی تھی اور اس بات سے ڈرتی رہی تھی کہ کہیں والدہ کو معلوم نہ ہو جائے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ یا پھر یہ ہو سکتا تھا کہ وہ بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئی ہو۔ اس کے حواس مختل ہو گئے ہوں لیکن یہ بات بھی کچھ دل کو لگتی نہیں تھی۔ وہ باقاعدہ بول رہی تھی' احتجاج کر رہی تھی لیکن یہ احتجاج کمزور تھا.......... پھر کسی وقت محبوب کو یوں محسوس ہوتا کہ سارہ پہلے سے ہی اس قسم کے سلوک کی توقع کر رہی تھی۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات موجود تھی کہ کسی وقت محبوب اس قسم کے رویے کا مظاہرہ کر سکتا ہے (ایک دن پہلے بھی تو وہ خاص بات کہنے کے لئے سارہ کے پاس پہنچا تھا لیکن کہہ نہیں سکا تھا) اگر واقعی ایسا تھا تو پھر یہ بات بھی متوقع تھی کہ سارہ اس اتھل پتھل سے آگاہ ہو جو تقریباً دو سال سے محبوب کے دل میں مچی ہوئی تھی۔ اور وہ خود بھی کسی نہ کسی حد تک اس اتھل پتھل کا شکار ہو۔ محبوب ان معاملات میں جتنا سوچتا تھا اتنا ہی الجھتا چلا جاتا تھا۔ دھیرے دھیرے اس نے سوچنے کی عادت پر قابو پانا شروع کر دیا۔ وہ اپنے دل کو سمجھانے لگا کہ جو اوراق وہ اپنی زندگی کی کتاب سے پھاڑ آیا ہے ان پر کیوں غور کر رہا ہے۔ ماضی اب مدفون تھا۔ اب وہ اس کی قبر پر بیٹھا کیوں نوحے پڑھ رہا تھا۔ اس نے بتدریج خود کو سنبھالنا شروع کر دیا۔ وہ دمام شہر میں مقیم تھا۔ جس کمپنی میں وہ کام کر رہا تھا وہاں پاکستانی اور انڈین باشندوں نے ایک ہاکی ٹیم بنا رکھی تھی۔ ہاکی کا شوق اسے شروع سے تھا۔ وہ اس ٹیم میں شامل ہو گیا۔ یوں ملازمت سے جو وقت بچتا تھا وہ اسپورٹس میں صرف ہو جاتا تھا۔ چھٹی کے روز وہ لوگ فلم دیکھتے تھے یا سیر کے لئے چلے جاتے تھے۔ گھر سے والد' والدہ اور باجی کے جو خطوط آتے تھے ان میں کسی وقت ارد گرد کے حالات کی جھلک بھی ملتی تھی۔ اس ارد گرد میں سارہ' خالہ عطیہ اور قدیر وغیرہ بھی شامل تھے۔ سارہ کے بارے میں محبوب کے کچھ اندیشے ختم ہو گئے تھے۔ اگر اس نے محبوب کے "اظہار محبت" کا ذکر خالہ عطیہ یا کسی اور سے کیا ہوتا تو یہ

بات والدین کی وساطت سے محبوب تک بھی پہنچ جاتی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ سارہ کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ اس نے بی اے کا امتحان بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا ہے اور ایم اے کرنا چاہ رہی ہے لیکن خالہ عطیہ نے اس کی شادی کا پکا ارادہ کر رکھا ہے۔ قدیر کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ بڑی عید کے موقع پر پاکستان آیا تھا اور قریباً ایک ماہ یہاں گزار کر گیا ہے۔ وہ پہلے سے کافی موٹا ہو چکا ہے اور ٹھاٹ باٹ سے رہتا ہے۔ وہ محبوب کے والدین سے بے حد اصرار کرتا رہا تھا کہ وہ محبوب کا ایڈریس دیں لیکن انہوں نے کہا تھا کہ محبوب کا ایڈریس تبدیل ہو چکا ہے اور نیا ایڈریس خود انہیں بھی معلوم نہیں ہے۔ آخر قدیر ناراض ہو گیا تھا اور دبئی واپس جاتے ہوئے محبوب کے گھر والوں سے مل کر بھی نہیں گیا تھا۔

کبھی کبھی محبوب کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنی بڑی بہن راحت کو خط لکھے اور اس سے قدیر اور سارہ کے بارے میں پوچھے (راحت کو قدیر اور سارہ کے معاملے کی خبر تھی) راحت اسے بتا سکتی تھی کہ ان دونوں کا معاملہ کہاں تک پہنچا ہے اور حالات نے ان دونوں کے لئے کیا رخ اختیار کیا ہے لیکن کوشش کے باوجود وہ راحت کو لکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ دیر کر دینا اس کی فطرت کا وصف خاص تھا۔ اس کی پوری زندگی اسی تذبذب سے عبارت تھی۔ زندگی میں صرف اور صرف تین موقع ایسے آئے تھے جب اس نے مختلف رویے کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک اس وقت جب اس نے اپنی اندرونی شکست و ریخت سے گھبرا کر بازارِ حسن کا رخ کیا تھا۔ دوسرے اس وقت جب اس نے سارہ کے سلسلے میں صحافی ناصر احمد کے آوارہ بھائی یاسر سے بات کی تھی اور تیسرے اس وقت جب لاہور کی اس طوفانی رات میں اس نے تاریکی کا سہارا لے کر سارہ سے اظہار محبت کر دیا تھا۔

☆==========☆==========☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ روز و شب ایک دوسرے کے تعاقب میں محو پرواز رہے' ہوائیں چلتی رہیں' بادل گرجتے برستے رہے' سورج مشرق سے مغرب تک اپنا سفر مکمل کرتا رہا۔ اسی طرح کوئی تین برس گزر گئے۔ محبوب اب خود کو کافی حد تک "سیٹل" کر چکا تھا۔ وہ ہر ماہ پچیس تیس ہزار روپیہ گھر بھیجتا تھا۔ افسران اپنے اس کم گو لیکن بہت محنتی ماتحت سے خوش تھے اور وہ اپنے کام سے مطمئن تھا۔

محبوب کی بہن راحت کی شادی بڑے اچھے طریقے سے انجام پا چکی تھی۔ محبوب

"کوشش" کے باوجود اس شادی میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ اب یہ بات تو وہ خود ہی جانتا تھا کہ اس نے کتنی "کوشش" کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہن کی شادی میں شریک ہونے کی شدید خواہش کے باوجود وہ خود کو پاکستان جانے پر آمادہ نہیں کر سکا تھا۔ اس نے سعودیہ سے ہی ڈھیروں روپیہ' ڈھیروں دعائیں اور ڈھیروں آنسو اپنی باجی کے نام کر دیے تھے۔ راحت اپنے گھر کی ہو چکی تھی۔ اب گھر میں محبوب کی شادی کی باتیں ہونے لگی تھیں لیکن وہ ابھی اس معاملے سے بہت دور رہنا چاہتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا دل ایک زخم ہے جس پر کھرنڈ آ رہا ہے۔ اگر کسی وجہ سے کھرنڈ اتر گیا تو اس کی ہر دھڑکن کے ساتھ اس کا پورا جسم لہو میں نہاتا چلا جائے گا۔

اسی طرح چند ماہ مزید گزر گئے۔ وہ اکتوبر کی ایک خوشگوار شام تھی۔ محبوب ایک تفریحی پارک میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ وہ پارک میں کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھ رہا تھا اور ان پھولوں کا موازنہ ان پھولوں سے کر رہا تھا جو اس کے وطن میں کھلتے تھے۔ اس کے گھر کے پچھواڑے پھلواری میں کھلنے والے پھول' کالج کے لان میں مہکنے والے پھول اور وہ پھول جو سارہ کے گھر دیوار پر ادھ چڑھی بیل میں مسکراتے تھے۔ جب کبھی بھی سارہ کے گھر دیوار پر چڑھی ہوئی دبلی پتلی بیل اسے یاد آتی تھی' نہ جانے کیوں سارہ سے اسے اپنی محبت بھی یاد آجاتی تھی۔ اس بیل اور اس محبت میں گہری مشابہت تھی۔ شاید یہ مشابہت منیر نیازی کے شعر نے پیدا کی تھی۔

پہلی بات ہی آخری تھی اس سے آگے بڑھی نہیں
ڈری ڈری سی بیل تھی جو دیوار پہ پوری چڑھی نہیں

دفعتاً کوئی پیچھے سے آیا اور بڑی شدت کے ساتھ محبوب سے لپٹ گیا۔ محبوب گرتے گرتے بچا تھا۔ لپٹنے والے کی گرفت میں انتہا درجے کی گرم جوشی تھی۔ محبوب نے بمشکل گھوم کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہ جیدا تھا۔ محبوب اور قدیر کا مشترکہ دوست۔ وہ ان کا راز داں بھی تھا۔ جیدا پہلے قدیر کا پڑوسی ہوا کرتا تھا پھر وہ کہیں اور چلا گیا۔ قدیر تو پھر بھی اس سے ملتا رہا لیکن محبوب سے اس کی ملاقات نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ جیدے سے محبوب کی آخری ملاقات کوئی چار سال پیشتر ہوئی تھی اور وہ بھی بالکل سرسری سی۔ جیدا اس وقت ائرکنڈیشنر اور فریج وغیرہ کا کورس کر رہا تھا۔ آج چار سال بعد وہ بالکل غیر متوقع طور پر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ جیدے نے محبوب کو چھوڑا تو دونوں ایک بار پھر

بغل گیر ہو گئے۔ پردیس میں اپنے دیس والوں کا ملنا اتنا ہی جذباتی ہوتا ہے، تاہم محبوب اور جیدے کے معاملے میں جذبات ایک جیسے نہیں تھے۔ جیدے کو دیکھ کر محبوب کو خوشی ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی کئی طرح کے اندیشے بھی منہ پھاڑ کر سامنے آ گئے تھے۔ جس ماضی سے ناتا توڑ کر وہ اس دیار غیر میں آبسا تھا وہ پھر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ اس کے روبرو آسکتا تھا، اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو۔ قدیر کا چہرہ اس کی نگاہوں میں آیا اور اسے لگا کہ یہ چہرہ ابھی اس پر تھوکنے لگے گا۔ ایک لمحے کے لئے تو اس کے دل میں آئی کہ نہایت بے رخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیدے سے دور چلا جائے۔ یا کسی بازار میں اچانک اس سے ہاتھ چھڑائے اور بھیڑ میں گم ہو جائے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا مزاج اور فطرت ہی ایسی نہیں تھی۔ وہ ایک بار مل کر جیدے سے جدا نہ ہو سکا۔ دونوں بڑی اپنائیت سے باتیں کرتے ایک قریبی ریستوران میں جا بیٹھے۔ عربی قہوے کی پیالی پر موضوعات کا پنڈورا باکس کھل گیا۔ محبوب نے پوچھا۔ "کیا کر رہے ہو یہاں؟"

جیدا قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "یار! ہم سب میں سے پڑھا لکھا تو تُو ہی نکلا۔ ہم سب تو دیہاڑی لگانے والے بن گئے۔ گلزار علی کویت میں نلکے ٹھیک کرتا ہے اور اس سالے قدیر کا تو تجھے پتا ہی ہے، دبئی میں "کارپینٹر" کا کام کرتا ہے۔ میں یہاں ایئر کنڈیشنر کے جڑوں میں گھسا رہتا ہوں۔ خدا کی پناہ۔ ایسا کتا کام ہے کہ کیا بتاؤں اور اوپر سے یہاں کی گرمی۔ لگتا ہے کہ دوزخ کی چوکیداری مل گئی ہے اور تُو سنا تو کیا کر رہا ہے؟ تُو تو بڑی اونچی ہواؤں میں ہے۔ تیرے کپڑے لتے سے ہی پتا چل رہا ہے۔ ویسے یار! تُو شروع سے ہی ساروں سے وکھرا تھا۔ بالکل اور ٹائپ کا۔ تیری عقل دوسرے ٹائپ کی تھی۔ ہم تجھے گاؤدی سمجھتے تھے لیکن یہ بات بھی مانتے تھے کہ پڑھائی میں تُو ٹھیک ٹھاک ہے.......... ایک دم ماسٹر۔"

"گاؤدی تو میں اب بھی ہوں۔"

"لیکن یار! اب تو تُو جنٹلمین بن چکا ہے۔ سچ پوچھ تو ہم تو تیرے پاسکو بھی نہیں ہیں۔ بچپن میں تو بالکل اور طرح کا تھا۔ بات وات تو کسی سے کرتا نہیں تھا۔ کسی سے یاری دوستی کیسے ہوتی، آجا کے ہم ہی تین چار یار تھے تیرے.......... یاد ہے تجھے تاش کھیلنی نہیں آتی تھی۔ ایک بار چکر دے کر ہم نے تجھ سے ڈیڑھ سو روپیہ جیت لیا تھا مگر بعد میں بتا بھی دیا تھا تجھے۔"

"ہاں۔ مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا۔" محبوب مسکرایا۔ پھر اس نے ذرا توقف کر کے

پوچھا۔ "قدیری کا کیا حال ہے آج کل؟"

"وہ سالا تو ایک دم نو سرباز نکلا ہے۔ لڑکی تو یوں پٹاتا ہے جیسے جھوٹ بولتے ہیں۔ آج کل دبئی میں کوئی بنگلہ دیشی پھنسا رکھی ہے اس نے.......... اس کے ساتھ مزہ بھی لے رہا ہے اور اس کے پیسے بھی کھا رہا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ بنگال کا جادو ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ وہ بنگال کا جادو ہے تو پھر تجھ پر چلنا چاہیے تھا، الٹا بنگال پر کیوں چل گیا ہے۔ کہتا ہے، پیارے! یہ اپنے اپنے "گٹس" کی بات ہوتی ہے.........."

جیدا بول رہا تھا اور محبوب حیرت میں گم سن رہا تھا۔ اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔ یہ جیدا کیا کہہ رہا تھا؟ جیدے نے تھوڑا سا اوپر اٹھ کر اپنی پتلون کی عقبی پاکٹ سے پرس نکالا، پھر ریال نکالے، پھر ایک اندرونی تہہ میں سے ایک تصویر نکال کر محبوب کے سامنے کر دی۔ پُرجوش لہجے میں بولا۔ "یہ ہے سالے کی نئی معشوقہ۔ دیکھو کتنے لمبے بال ہیں کم بخت کے۔ کسی پاکستانی اور انڈین ایکٹریس کے بھی کیا ہوں گے۔ واقعی بنگال میں جادو تو ہے۔"

محبوب نے لرزتے ہاتھ سے تصویر تھامی۔ ایک درمیانی شکل و صورت کی لڑکی قدیر کی بانہوں میں بانہیں ڈالے کھڑی تھی۔ اس نے ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بال بڑے اسٹائل میں بنائے ہوئے تھے۔ قدیر سرخ بوشرٹ اور جینز میں تھا۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ پہلے سے کافی فربہ ہو گیا تھا۔ محبوب پتھرائی ہوئی نظروں سے تصویر کو دیکھنے لگا۔ قدیر اس کا دوست اور رازداں رہا تھا لیکن اس کا یہ موجودہ روپ محبوب کے لئے بالکل نیا تھا۔ اسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا اور لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ".......... اور وہ مالک مکان کی لڑکی سارہ.......... اس سے بھی تو زبردست چکر چل رہا تھا اس کا۔"

جیدے نے ماحول کی پروا کیے بغیر بلند قہقہہ لگایا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "اس قصے کو چھوڑو یار! وہ تو گئی گزری بات ہے۔"

جیدے کے لہجے نے محبوب کو تھوڑا سا چونکا دیا۔ وہ بولا۔ "پھر بھی یار! کچھ تو بتاؤ۔ میں تو اتنے عرصے سے یہاں ہوں۔ کچھ خبر ہی نہیں آگے پیچھے کی۔"

جیدے نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا اور دلچسپ انداز میں بولا۔ "بات کافی پرانی ہو گئی ہے اس لئے تجھے بتانے میں حرج نہیں یار.......... تُو سچ پوچھتا ہے تو وہ لڑکی قدیری

کے چکر میں تھی ہی نہیں۔ قدیری تو بس اسے چالاکی سے کھینچ لے گیا۔"

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔"

جیدا مسکراتے ہوئے بولا۔ "یار جی! وہ لڑکی دراصل تیرے چکر میں تھی۔ تجھے پتا ہے قدیری شروع سے بڑا چالاک ہے۔ بس وہ ایک دم سے بیچ میں کود پڑا۔"

"کک......... کیا کہہ رہے ہو جیدے! میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔" محبوب کا دل سینے میں جیسے برف کا گولہ بن کر رہ گیا تھا۔

جیدا بولا۔ "یار! جہاں تک میں نے نتیجہ نکالا ہے' وہ لڑکی شروع میں تجھ پر ہی نظر رکھتی تھی۔ وہ اکثر میرے اور قدیری کے پاس ڈھارے (نیم پختہ کمرے) میں آیا کرتی تھی۔ وہ جب بھی آتی تھی' تیری ہی باتیں کرتی تھی۔ ایک روز قدیری سے کہنے لگی "قدیری! محبوب بھائی جان تیرے بڑے پکے دوست ہیں۔ بڑے لائق فائق بھی ہیں۔ ان سے کہو مجھے تھوڑی دیر کے لئے انگریزی ہی پڑھا دیا کریں۔"

قدیری بولا۔ "محبوب بھائی جان کے سوا کوئی اور بات بھی آتی ہے تمہیں؟ کوئی چیز ہم سے بھی سیکھ لو۔ ہمیں بھی بڑے ہنر آتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "چلو جب سلائی کڑھائی کا ٹائم آیا تو وہ تم سے سیکھ لوں گی۔"

"تم جانتے ہی ہو وہ ہنس مکھ لڑکی تھی اور صاف سیدھی بات کرتی تھی۔ اپنا قدیری جلیبی کی طرح ٹیڑھا تھا اور اب بھی ہے۔ باتوں باتوں میں بندے کی مت مار دیتا ہے۔ وہ دھیرے دھیرے سارہ کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔ کھٹی میٹھی باتوں سے سارہ اور اس کی ماں سے بے تکلف ہوتا چلا گیا۔ اس نے سارہ کے ذہن میں یہ بات بھی ڈال دی کہ تم پہلے سے ہی ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو' اس کا نام شہلا ہے اور وہ ایک بہت پڑھے لکھے گھرانے کی لڑکی ہے۔ شاید تمہیں یاد نہ ہو ان دنوں قدیری کی کوشش رہتی تھی کہ تم ان کے گھر نہ جاؤ بلکہ وہ تمہارے گھر چلا جائے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری موجودگی میں سارہ بھی ڈھارے میں چلی آئے اور تمہیں ایک دوسرے سے باتیں شاتیں کرنے کا موقع ملے۔ یہ قدیری شروع سے بڑی شے تھا پیارے۔ ایک بار میں نے کہا۔ یار! تم محبوب سے دھوکا کر رہے ہو۔ کہنے لگا' دھوکا نہیں اس کا بھلا کر رہا ہوں۔ یہ کڑی اس کے لائق نہیں ہے۔ اسے کوئی اور پھنسا کر دیں گے۔ آہستہ آہستہ قدیری نے سارہ کو شیشے میں اتار لیا۔ سارہ اگر قدیری کی طرف گئی تو اس میں جہاں قدیری کی تیزی طراری کا ہاتھ تھا وہاں

میرے خیال میں تمہاری بے پروائی یا سستی بھی تھی۔ بہرحال جب قدیری نے رات دن ایک کر کے سارہ کو پھنسا لیا تو تمہی سے اسے خط شط بھی لکھوانے لگا۔ بڑا استاد بندہ ہے وہ .... ہم تم اس کے پائے کے نہیں ہیں۔ ویسے ایک بات کہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ سارہ قدیر کے ساتھ پھنس کر بھی تجھے خاص نظر سے دیکھتی رہی ہے۔"

محبوب سکتے کی کیفیت میں تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے گزرے دنوں کی فلم چل رہی تھی۔ وہ ماضی جو دفن ہو چکا تھا یا محبوب کا خیال تھا کہ دفن ہو چکا ہے' اپنی قبر پھاڑ کر نکل آیا تھا اور چیخم دھاڑ مچا رہا تھا۔ جیدا جو باتیں کہہ رہا تھا ان میں وزن تھا۔ ان میں چھپی ہوئی سچائی آپوں آپ محبوب پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ ایک پردہ سا محبوب کے سامنے سے اٹھتا جا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ قدیر ہمیشہ اسے "شہزادے" کہہ کر مخاطب کرتا تھا کبھی کبھار محبوب کو شک گزرا کرتا تھا کہ اس لقب میں تضحیک کا عنصر بھی شامل ہے۔ جیسے قدیر' محبوب کو کم فہم یا غائب دماغ کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں سکتا اور شہزادہ کہہ دیتا ہے۔ قدیر نے ایک دوبار محبوب کے منہ پر بھی کہا تھا۔ "تم تو بادشاہ بندے ہو یار! تمہیں فلاں بات کا کیا پتا؟" آج برسوں بعد محبوب کو یقین ہونے لگا تھا کہ اس کا شک درست تھا۔ پھر اسے سارہ کی ایک بات یاد آئی۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب وہ راولپنڈی منتقل ہونے سے پہلے اسے پڑھانے جایا کرتا تھا۔ سارہ نے کہا تھا۔ "جب آپ پڑھاتے ہوئے کوئی بات سمجھاتے ہیں تو سیدھی میرے دماغ میں اتر جاتی ہے۔ میں کوئی آپ جیسا پڑھانے والا ہی ڈھونڈ رہی تھی بلکہ شاید آپ ہی کو ڈھونڈ رہی تھی۔" پھر اچانک محبوب کے ذہن میں ماضی کا ایک اور در کھل گیا۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ محبوب نے کئی بار سوچا تھا کہ سارہ گاہے گاہے شہلا کا ذکر کیوں کرتی ہے' کیوں شہلا کے حوالے سے اسے ٹٹولنا چاہتی ہے۔ آج اس بات کا جواب جیدے نے اپنی باتوں میں دے دیا تھا۔ اس نے انکشاف کیا تھا "شہلا" کے بارے میں سارہ کو سب سے پہلے قدیر نے ہی بتایا تھا اور اپنی باتوں سے باور کرایا تھا کہ محبوب چپکے چپکے شہلا کو چاہتا ہے اور اس کی محبت میں آہیں بھرتا ہے۔

واقعات کی کڑیاں آپس میں ملتی جا رہی تھیں۔ ایک زنجیر مکمل ہو رہی تھی۔ "کہاں کھو گئے یار؟" جیدے نے کہا۔ "اتنے عرصے بعد ملے ہیں' کوئی بات کرو۔ کچھ اپنی سناؤ' کچھ ہماری سنو اور کوئی لڑکی شڑکی بھی تاڑی ہے کہ ابھی تک دوسروں کے پریم پتر ہی

لکھ رہے ہو۔"

آخری فقرہ کچھ زیادہ ہی بے تکلفی لئے ہوئے تھا' محبوب کو ناگوار گزرا مگر وہ پرانے دوست کی نادانی سمجھ کر درگزر کر گیا۔ اس نے جیدے سے پوچھا کہ تم کب سے یہاں ہو؟ وہ بولا۔ "کوئی چھ مہینے ہوئے ہیں۔ میرے تو خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ تم سے ملاقات ہو جائے گی۔ پچھلے مہینے قدیری کا خط ملا تھا۔ اس میں تمہارا ذکر بھی تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ شہزادہ تو پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا ہے۔ لگتا ہے کہ اس پر کسی نے تعویذ کر دیے ہیں۔ پہلے پنڈی میں غائب رہا تھا۔ اب سعودی عرب گیا ہے اور ایسا گیا ہے کہ بس چلا ہی گیا ہے۔ گھر والوں کو اس نے پتا نہیں کیا پڑھا دیا ہے۔ وہ اس کا ایڈریس تک بتانے سے انکار کرتے ہیں۔" جیدے نے ایک لمحہ توقف کر کے محبوب کی طرف دیکھا اور بولا۔ "کیا واقعی تم نے کسی کو اپنا ایڈریس نہیں بتایا؟"

محبوب گڑبڑا گیا۔ "نہیں ایسی بات نہیں یار! بس یہ کمپنی والوں کا کوئی چکر ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کے پاکستانی ملازموں کے پتے ٹھکانے کا کسی کو پتا چلے۔" محبوب نے سفید جھوٹ بولا۔

جیدے نے آنکھیں گمائیں۔ "اسی لئے تو کہتا ہوں یار کہ تو بہت اونچا آدمی بن گیا۔ کمپنی تجھے چھپاتی پھرتی ہے۔ ایک ہم ہیں کہ ہم اپنی کمپنی کو چھپاتے پھرتے ہیں۔ بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ کہاں کام کر رہے ہیں۔"

جیدے کی زبان بڑی تیز چل رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ پچھلے چار پانچ سال کی کسر وہ آج ہی نکال لینا چاہتا ہے۔ اسی دوران میں اسے یاد آگیا کہ اس نے اپنے "ڈیرے" پر فون بھی کرنا ہے۔ وہ محبوب سے چند منٹ کی اجازت لے کر فون کرنے چلا گیا۔ ایک بار پھر محبوب کے دل میں آئی کہ وہ یہاں سے نکل لے لیکن اب نکلنا بے سود تھا۔ وہ جیدے کو اپنی کمپنی کا نام پتا بتا چکا تھا۔ جیدے کے لئے محبوب کو ڈھونڈنا اب زیادہ مشکل نہیں تھا۔

اس نے سگریٹ سلگائی اور قہوے کی خالی پیالی کو گھورنے لگا۔ ماضی کی یادیں کسی فوج کے جنگجو دستوں کی طرح کلاوے کاٹ کاٹ کر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ ان یادوں سے کہیں مفر نہیں رہا تھا۔ وہ طوفانی شب ایک بار پھر محبوب کے پردہ تصور پر نمودار ہو گئی تھی جب اس نے پہلی بار سارہ کو چھوا تھا' اسے اپنے قریب کیا تھا اور اس کے سہمے ہوئے

سانسوں کی حرارت اپنے رخساروں پر محسوس کی تھی۔ وہ کیسی قیامت کی گھڑیاں تھیں۔ وہ سراپا حسن تھی اور وہ سراپا عشق۔ محبوب کے ذہن میں سیکڑوں بار یہ سوال ابھرا تھا کہ اس رات سارہ نے قرار واقعی مزاحمت کیوں نہیں کی تھی۔ وہ محبوب کو کسی خاص نظر سے نہیں دیکھتی تھی تو پھر اس کی دست درازی پر وہ پھٹ کیوں نہیں پڑی تھی۔ کئی سوالوں کی طرح آج اس سوال کا جواب ڈھونڈنا بھی محبوب کے لئے مشکل نہیں رہا تھا۔ سارہ اس سے محبت کرتی تھی بالکل جیسے محبوب اس سے محبت کرتا تھا۔ قدیر کے آنے کے بعد سارہ کی محبت روپوش ہو گئی تھی لیکن مٹی نہیں تھی۔ دل کے اندر کہیں بہت گہرائی میں یہ محبت کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی۔ جیسے کسی بہت گہرے اور تاریک کنوئیں میں ایک ستارے کا عکس جگنو کی طرح ٹمٹما رہا ہو۔ ہاں یہ محبت ایک تارے' ایک جگنو یا ایک کرن کی صورت میں موجود تھی۔

وہ دن محبوب کی زندگی کا ایک ناقابل فراموش دن تھا۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر اس پر ایسے انکشافات ہوئے تھے جس نے اس کی گزشتہ زندگی کا نقشہ بدل دیا تھا۔ ماضی کی ساری بساط الٹ پلٹ ہو گئی تھی۔ مہرے تنکوں کی طرح بکھر گئے تھے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر اس ریستوران میں جیدے کے ساتھ بیٹھا رہا۔ اس کے اردگرد کا ہر منظر دھندلایا دھندلایا تھا پھر جیدا بہت اصرار کر کے اسے اپنے ڈیرے پر لے گیا تھا۔

جیدے نے اور اس کے دوستوں نے کھانے میں بہت سی پاکستانی ڈشیں اس کے سامنے لا رکھی تھیں۔ آلو مٹر کا سالن' ماش کی دال' چکن بریانی اور تندوری روٹی۔ ساتھ میں زردہ بھی تھا۔ محبوب نے جیدے کے اصرار پر کھانا کھایا تھا لیکن مزہ اسے نہیں آیا تھا۔ من و سلویٰ بھی ہوتا تو شاید اسے مزہ نہ دیتا۔ اس کا دل و دماغ تو طوفان کی زد میں تھا۔ رات ایک بجے محبوب اپنی رہائش گاہ پر واپس لوٹ آیا اور ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ وہ اسی لئے ماضی کا سامنا کرنے سے ڈرتا تھا۔ وہ زخم جو تین ساڑھے تین سال میں مندمل ہوئے تھے۔' ایک ہی بے رحم کھرونچے نے لہولہان کر دیے تھے۔ یہ کاتب تقدیر نے اس کی کتاب زندگی کا کیسا ورق پلٹ دیا تھا۔ اس ورق پر درد ہی درد اور حیرتیں ہی حیرتیں لکھی تھیں۔ وہ اب تک قدیر سے منہ چھپاتا پھر رہا تھا لیکن آج اس پر انکشاف ہوا تھا کہ منہ چھپانے کی ضرورت تو شاید قدیر کو ہے۔ محبوب اپنی زندگی کی جس سب سے بڑی محرومی کا شکار ہوا تھا اس محرومی کی شروعات قدیر کی مطلب پرستی نے کی تھی۔ بلاشبہ

اپنی جگہ محبوب بھی مجرم تھا لیکن قدیر............ اس سے بڑا مجرم تھا۔

پھر اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ کہیں وہ نتائج اخذ کرنے میں جلدی تو نہیں کر رہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ جیدا اسے حالات کی صحیح تصویر نہ دکھا رہا ہو مگر سوچنے کی بات یہ بھی تھی کہ جیدے کو حالات کا غلط رخ پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ محبوب سارہ کی محبت میں کس بری طرح گرفتار ہے۔ وہ تو اس سارے قصے کو ماضی کا حصہ سمجھ رہا تھا' اور پھر وہ تصویر جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔ اس تصویر سے کچھ اور نہ بھی ثابت ہوتا ہو' قدیر کی بے وفائی تو ثابت ہو جاتی تھی۔

دو تین روز محبوب نے شدید کرب کے عالم میں گزارے۔ اس نے زندگی میں بہت کم نفرت کی تھی لیکن قدیر کے خلاف اس کے ذہن میں نفرت ابھر آئی تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا۔ اس کے علاوہ محبوب کے اندر ایک اور تبدیلی آئی تھی۔ وہ سارہ کو دیکھنا چاہتا تھا' ایک نئے زاویے سے' ایک نئی سوچ کے ساتھ۔ اس نے اب تک قدیر کی محبوبہ کو دیکھا تھا' اب وہ ایک ایسی لڑکی کو دیکھنا چاہتا تھا جو اس سے محبت کرتی تھی یا کبھی کرتی رہی تھی۔

.... محبوب ہر دوسرے تیسرے روز جیدے کے ڈیرے پر جانے لگا۔ وہ بھی فارغ وقت ملتے ہی محبوب کے پاس آجاتا تھا۔ گم شدہ ماضی اپنی تمام تر بے قراریوں اور کربناکی کے ساتھ دوبارہ محبوب کے سامنے تھا۔ نہ جانے کیوں............ وہ جو پاکستان سے دور بھاگتا تھا' اب پاکستان جانا چاہتا تھا۔ کوئی شے اسے مسلسل اپنی جنم بھومی کی طرف کشش کر رہی تھی۔ انہی دنوں ایک اور ایسا واقعہ ہوا جس نے اس کے ارادے کو مہمیز کیا۔ بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ تھا اور بھولے بسرے ماضی کا حصہ تھا لیکن محبوب کے لئے اس واقعے کی بھی اہمیت تھی۔

وہ ایک دن جیدے کے ڈیرے پر پہنچا۔ جیدے کا ڈیرا محبوب کی رہائش گاہ سے پانچ چھ میل دور ایک زیر تعمیر کالونی میں تھا۔ کئی افراد مل کر وہاں رہتے تھے۔ ایک سکھ تھا اور تین پاکستانی۔ اس روز چھٹی تھی۔ جیدا اور اس کے دو ساتھی گھومنے پھرنے کے لئے نکلے ہوئے تھے۔ صرف سکھ نوجوان شوبھا سنگھ وہاں موجود تھا۔ اس نے محبوب کا استقبال کیا۔ اسے چائے وغیرہ پلائی' اخبار لا کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ ڈیڑھ دو گھنٹے تک وہ لوگ واپس آجائیں گے۔ محبوب وقت گزاری کے لئے اخبار دیکھتا رہا پھر اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔

یہاں جیدے کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ ایک اٹیچی کیس میں بہت سی کتابیں کاپیاں اور رسالے بھرے ہوئے تھے۔ محبوب ان کتابوں کاپیوں کو پہچانتا تھا۔ ان کا تعلق قدیر سے تھا۔ جن دنوں سارہ کی فرمائش پر قدیر نے پڑھائی شروع کرنے کی ٹھانی تھی انہی دنوں یہ کتابیں خریدی گئی تھیں' پھر کچھ عرصے بعد قدیر کا شوق تو ختم ہو گیا تھا اور یہ سارا پلندہ جیدے کے پاس چلا گیا تھا۔ اس پلندے کے ساتھ شاید قدیر کا شوق بھی جیدے میں منتقل ہو گیا تھا۔ وہ ابھی تک ان کتابوں سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ کم از کم میٹرک تو کر کے رہے گا۔

محبوب یونہی وقت گزاری کے لئے ان کتابوں کو دیکھنے لگا۔ کئی بھولی بسری یادیں تازہ ہوئیں۔ ایک کاپی میں محبوب کے تحریر کردہ شعر موجود تھے۔ ایک کتاب پر اس نے قدیر کی آسانی کے لئے پنسل سے نشان لگا رکھے تھے۔ اس کی "چیک" کی ہوئی دو تین کاپیاں بھی اس پلندے میں موجود تھیں۔ ایک لفافے میں چند بہت پرانی تصویریں برآمد ہوئیں۔ ان تصویروں میں محبوب سمیت قدیر کے چند دوست تھے۔ وہ نہر پر نہا رہے تھے۔ سیر گاہوں میں گھوم رہے تھے۔ مستقبل کے حوادث سے بے خبر اپنے لڑکپن سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر یادوں کے گرداب میں پھنس گیا۔ کتابیں دیکھنے کے بعد وہ بوسیدہ رسالے دیکھنے لگا۔ ایک رسالے میں سے تین تہہ شدہ کاغذ پھسل کر فرش پر گر گئے۔ محبوب نے بے خیالی میں انہیں اٹھا کر دوبارہ رسالے میں رکھا لیکن ان میں سے ایک کاغذ کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔ اس نے کاغذ کی برسوں پرانی تہیں کھولیں اور ششدر رہ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ایسا کاغذ تھا جو اس نے برسوں پہلے کھویا تھا اور پھر کئی ہفتے تک اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈا تھا۔ یہی وہ خط تھا جو اس نے اپنی محبت کے آغاز میں سارہ کو لکھا تھا اور اس تک پہنچانے کے لئے اپنی چرمی فائل میں چھپایا تھا۔ پھر ایک روز وہ خط یوں غائب ہوا تھا کہ ڈھونڈے نہیں ملا تھا اور اس گمشدگی نے محبوب کو خوف کے شکنجے میں جکڑ کر اس کے سارے ارادے تہس نہس کر دیئے تھے۔ آج یہ خط قدیر کے کاغذوں میں سے مل گیا تھا۔

اس خط کی "برآمدگی" نے قدیر کا کردار کچھ اور واضح کر دیا تھا۔ دوست کے بھیس میں چھپا ہوا وہ بدخواہ آج محبوب کے سامنے بے نقاب تھا۔ محبوب کا دل رنج و الم سے بھر گیا۔ کچھ لوگوں میں نفرت کا جذبہ انتقام بن جاتا ہے اور کچھ لوگوں میں آنسو بن کر بہہ جاتا

ہے۔ محبوب دوسری قسم کے لوگوں میں سے تھا۔ اس رات بند کمرے میں اس نے دیر تک آنسو بہائے تھے۔

☆==========☆==========☆

ٹھیک ایک ماہ بعد محبوب پی آئی اے کے ذریعے سعودی عرب سے پاکستان پہنچا۔ اس کی فلائٹ اسلام آباد تک تھی۔ اسلام آباد سے اسے براستہ سڑک لاہور پہنچنا تھا۔ لاہور' جہاں اس کے والدین تھے' جہاں وہ گلی تھی جس میں اس کا لڑکپن گزرا تھا۔ جہاں وہ چار دیواری تھی جہاں خالہ عطیہ اور سارہ رہتی تھیں۔ وہ سب کچھ جو اس کی سادگی اور اس کے دوست کی تیز طراری نے بتدریج اس سے چھین لیا تھا۔ وہ ایک بار پھر ان سارے مناظر کو دیکھنا چاہتا تھا' ایک نئے انداز سے' ایک نئے رخ سے۔

راولپنڈی کے نواحی قصبے فتح جنگ میں اس کی بڑی بہن راحت بھی بیاہی ہوئی تھی۔ وہی راحت جس کی شادی میں بھی وہ شریک نہیں ہو سکا تھا۔ راولپنڈی کی مانوس فضا میں پہنچتے ہی اس کا دل تڑپ اٹھا۔ اسے یہ حوصلہ نہیں ہوا کہ وہ بہن سے ملے بغیر لاہور کا رخ کرلے۔ بہن کا مکمل پتا اس کے پاس موجود تھا۔ اس کا شوہر ایک وفاقی محکمے میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ اسلام آباد سے ڈائریکٹ لاہور روانہ ہونے کے بجائے محبوب اپنی بہن کے گھر چلا گیا۔ برسوں بعد بہن بھائی کی ملاقات یادگار تھی۔ وہ دونوں گلے لگ کر دیر تک روئے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ راحت سمیت محبوب کے آنے کی اطلاع کسی کو بھی نہیں تھی لہٰذا راحت جتنا بھی خوش ہوتی کم تھا۔ راحت ہی وہ واحد ہستی تھی جس کے ساتھ محبوب قدرے کھل کر بات کرتا تھا ورنہ عام لوگوں کی طرح اہل خانہ بھی یہی کہتے تھے کہ وہ منہ میں گھنگنیاں ڈالے رہتا ہے۔ ایک بار راحت اور محبوب کی باتیں شروع ہوئیں تو پھر ختم ہونے میں نہیں آئیں۔ انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ کب شام ہوئی اور رات ہو گئی۔ کھانا وغیرہ کھا کر اور گاڑی میں تھوڑا سا گھومنے کے بعد وہ پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ راحت کے میاں کام کے سلسلے میں گجرات گئے ہوئے تھے۔ وہ دونوں مکمل آزادی سے بات چیت کر رہے تھے۔ گفتگو کے ایک مرحلے میں محبوب نے سارہ کے بارے میں پوچھا۔ راحت نے ایک لمبی سانس کھینچی اور بولی۔ "وہ تمہارا دوست قدیر تو بالکل دھوکے باز نکلا۔ جب یہاں سے گیا تھا تو سارہ کے نام کی مالا جپتا تھا۔ وہاں جا کر اس نے کچھ اور ہی گل کھلا دیے۔ سنا ہے دو تین لڑکیوں سے اس کا ملنا جلنا رہا ہے۔ ایک بنگالن کے خط تو

اس کے پیچھے لاہور بھی آتے رہے ہیں۔ سارہ کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔ وہ تو پیدائشی صابر شاکر ہے۔ اس نے قدیر سے شکوہ شکایت تک نہیں کی۔ بس خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی۔ پچھلی دفعہ جب میں لاہور گئی تھی تو اس سے ملی تھی۔ بڑی گم صم اور سنجیدہ ہو گئی ہے۔ گرمیوں میں ڈیڑھ دو مہینے' بیمار بھی رہی ہے۔ اب کہہ رہی تھی کہ ایم اے کی تیاری کر رہی ہوں۔ یہ امتحان دے کر رہوں گی۔ اس کی چھوٹی بہن کی منگنی ہو چکی ہے۔ اگلے مہینے کے شروع میں شادی بھی ہے لیکن سارہ کسی صورت شادی کی طرف نہیں آ رہی۔ ایک دو اچھے رشتے بھی آئے ہیں لیکن وہ مانی نہیں اور خدا لگتی بات یہی ہے محبوب! شادی تو خوشی کا نام ہے۔ دل میں ہی خوشی نہ ہو تو شادی کیسی۔ ہو سکتا ہے کسی وقت دل ٹھکانے آجائے تو مان جائے۔"

محبوب نے کہا۔ "جب قدیر کی دغابازی ثابت ہو گئی ہے تو پھر وہ کیوں سوگ منائے بیٹھی ہے؟"

راحت کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔ "میرا خیال ہے محبوب! اس کے ساتھ قدیر کی بے وفائی کا مسئلہ ہی نہیں ہے' کوئی اور بات بھی ہے جس نے اس کا من مار رکھا ہے۔"

"اور بات؟" محبوب کے سینے میں جلترنگ سے بج اٹھے۔

"ہاں کوئی اور بات ہے۔ میں ٹھیک سے نہیں جانتی لیکن مجھے لگتا ہے کہ شاید کوئی اور اس کی زندگی میں آیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے خاندان کا ہی کوئی لڑکا ہو۔ ان کا خاندان بھی تو بہت بڑا ہے۔ بڑے اچھے اچھے لڑکے بھرے پڑے ہیں ان میں.......... بہرحال ہمیں کیا۔ یہ ان لوگوں کا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے تو عادت ہی نہیں خواہ مخواہ ٹوہ لگانے کی۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" محبوب نے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ قدیر سے اس کا دل بالکل کھٹا ہو گیا تھا۔ دل کھٹا ہونے کے بعد ہی وہ کسی اور طرف متوجہ ہوئی ہے۔"

محبوب نے کہا۔ "لیکن باجی! تمہاری تو وہ پکی سہیلی ہے۔ تمہیں تو معلوم ہونا چاہیے۔"

"بھئی جب اس نے نہیں بتایا تو میں کیوں کریدتی پھروں۔ بس ایک مرتبہ اتنا بولی

تھی کہ وہ پاگلوں کی طرح سوچتی رہتی ہے۔ میں نے پوچھا تھا کہ کسی کے بارے میں سوچتی ہو یا یونہی سوچتی ہو؟ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی' کوئی ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ میں نے پوچھا تھا' اگر کوئی ہے تو جیتا جاگتا بندہ ہے یا خوابوں کا شہزادہ۔ کہنے لگی نہ بندہ ہے نہ شہزادہ ہے لیکن جو بھی ہے بہت عجیب ہے۔"

محبوب کے سینے میں ایک چراغاں سا ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ تاریکی جو برسوں سے اس کے اندر مسلط تھی' کونے کھدروں میں چھپ رہی تھی۔ محبوب کا دل گواہی دے رہا تھا کہ سارہ اس سے محبت کرتی تھی اور آج بھی کرتی ہے۔ باجی راحت نے غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ شاید قدیر کی بے وفائی کے بعد سارہ کی زندگی میں کوئی اور لڑکا آگیا ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ لڑکا تو پہلے سے موجود تھا بلکہ یہ تو کہانی ہی اس لڑکے کی تھی۔ قدیر نے تو زبردستی اس کہانی میں اپنا آپ ٹھونسا تھا۔ یہ اس لڑکے اور سارہ کی کہانی تھی۔ ہاں یہ محبوب اور سارہ کی کہانی تھی۔ اب تک محبوب خود کو بانو قدسیہ کا "راجا گدھ" سمجھتا رہا تھا' لیکن راجا گدھ وہ نہیں قدیر تھا۔ محبوب کے دل میں امنگ ترنگ کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اڑ کر لاہور پہنچ جائے' سارہ کو دیکھے اور ہر تذبذب کو بالائے طاق رکھ کر اس سے کہہ دے۔ "سارہ! میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں ابھی اور اسی وقت اپنا بنانا چاہتا ہوں۔"

ایک میٹھا میٹھا سا درد اس کے جسم میں لہریں لینے لگا۔ ایک لرزش سی ہاتھ پاؤں میں نمودار ہو گئی۔ کیا وہ ایسا کر سکے گا۔ کیا وہ مرحلہ طے کر لے گا۔ وہ اگلے روز سہ پہر کو لاہور پہنچا۔ راحت بھی اس کے ساتھ چل دی تھی۔ راستے ہی میں راحت نے بذریعہ فون گھر والوں کو محبوب کی آمد کی اطلاع دے دی۔

جب ساڑھے تین سال بعد اس نے اپنے گھر کی دہلیز پار کی تو اس کے پیاروں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ وہ دیوانہ وار اس سے لپٹ گئے۔ کچھ قریبی عزیز بھی پہنچ چکے تھے۔ میلے کا سماں تھا۔ اس کے سر پر مسلسل دست شفقت پھر رہا تھا اور پیشانی بوسوں کی زد میں تھی۔ محلے کی عورتیں بھی جمع ہو گئیں۔ بیٹھک ملنے جلنے والوں سے بھر گئی۔

"ماشاء اللہ اب تو جوان ہو گیا ہے۔" کسی عورت نے کہا۔

"اللہ سلامت رکھے' بڑا نیک بچہ ہے۔ ہم تو اس کی مثالیں دیتے ہیں۔" ایک

بوڑھی بولی۔

چھوٹا بھائی عاطف اسے کھینچ کر بیٹھک میں لے گیا۔ محلے والوں نے معانقے کر کر کے اسے بے حال کر دیا۔ ایک نے کہا۔ "واہ بھئی! یہ چھوٹی چھوٹی داڑھی تو بڑی سج رہی ہے تیرے چہرے پر۔"

اس کے پڑوسی ارشاد صاحب بولے "ماشاء اللہ کافی صحت مند ہو گئے ہو۔ پورے مرد لگتے ہو۔"

بوڑھے ماسٹر عنایت نے کہا "مرد نہیں' مردِ مجاہد کہو۔ کیسی چمک ہے پیشانی پر اور کیوں نہ ہو' اب تو اللہ کا گھر بھی دیکھ لیا ہے۔ چھوٹی سی عمر میں یہ سعادت نصیب ہونا بڑی بات ہے۔"

کچھ دیر مردوں میں بیٹھ کر وہ پھر عورتوں میں آگیا۔ اس کی نگاہ سارہ یا خالہ عطیہ کو ڈھونڈ رہی تھی لیکن وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اس کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ بہرحال اس بے چینی نے زیادہ طول نہیں کھینچا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے خالہ عطیہ نظر آئیں۔ وہ ابھی ابھی بیرونی دروازے سے داخل ہوئی تھیں۔ عورتوں کی بھیڑ اب کم ہو چکی تھی۔ خالہ عطیہ سیدھی اس کے پاس آئیں۔ دونوں ہاتھوں سے پیار کیا۔ منہ سر چوما اور بلائیں لیں۔ ان کے ہاتھ کے لمس نے ماں کے ہاتھوں کی طرح محبوب کو سکون دیا۔ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں اور باتیں کرنے لگیں۔ "بیٹا! تُو تو ہم سب سے جیسے روٹھ ہی گیا ہے۔ کتنی رونق تھی تیرے دم قدم سے یہاں۔ ہر شام تیری صورت دیکھتے تھے اور آواز سنتے تھے۔ اب تو سب خواب ہو گیا ہے۔ بچیاں ہر وقت پوچھتی رہتی ہیں کہ محبوب بھائی جان کب آئیں گے' اور سارہ تو اتنا یاد کرتی ہے تجھے کہ بس کیا بتاؤں۔ پتا نہیں اس کا سگا بھائی بھی ہوتا تو اس طرح چاہتی یا نہیں۔ ابھی کل ہی مجھ سے کہہ رہی تھی "پتا نہیں پردیس میں کیا بات ہے۔ جو وہاں جاتا ہے' سب کچھ بھول جاتا ہے۔ پتا نہیں لوگ کیوں چھوڑتے ہیں گھر بار کو" میں نے کہا' محبوب کی بات کر رہی ہو؟ کہنے لگی "ہاں انہی کی بات کر رہی ہوں۔ کتنا اچھا ہو کہ وہ اچانک یہاں آ جائیں اور کچھ نہیں تو میری شادی میں ہی شامل ہو جائیں۔"

محبوب کے بدن میں ایک یخ بستہ لہر دوڑ گئی۔ "شش........... شادی کس کی شادی؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"سارہ کی شادی۔" خالہ عطیہ نے کہا۔ "وہ تو مانتی ہی نہیں تھی بیٹا! دو سال سے اڑی بیٹھی تھی۔ کہتی تھی نہیں، بس پڑھوں گی اور پڑھتی چلی جاؤں گی۔ بڑی مشکل سے راضی ہوئی ہے۔ اب چھوٹی شاہین کے ساتھ اس کے بھی ہاتھ پیلے ہو جائیں گے۔ اللہ نے بڑی جلدی سبب لگا دیا ہے۔ دونوں کا فرض ایک ساتھ ہی ادا ہو جائے گا۔"

خالہ عطیہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں لیکن محبوب کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کی تمام حسیات منجمد ہو گئی تھیں۔ سینے میں ایک یخ بستگی پھیل گئی تھی اور اس برف میں اردگرد کی ہر شے منجمد ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ سعودی عرب سے ایک زبردست محبت نامہ اپنے دل پر لکھ کر یہاں لایا تھا لیکن ایک بار پھر اس نے یہ محبت نامہ سارہ تک پہنچانے میں دیر کر دی ہے اور نامہرباں وقت نے قدیر کا روپ دھار کر یہ محبت نامہ ہمیشہ کے لئے کہیں چھپا دیا ہے۔ وہی حسرت آمیز مایوسی اس پر طاری ہو رہی تھی جو اب تک قدم قدم پر اس کے ساتھ رہی تھی۔

ایک دم محلے کی اور کئی خالائیں اور آنٹیاں اندر آ گئی تھیں۔ چھوٹا سا برآمدہ کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ یہی وقت تھا جب محبوب نے سارہ کی جھلک دیکھی۔ وہ سب سے پیچھے کھڑی تھی اور ایک عورت کے کندھے کے اوپر سے محبوب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ محبوب حیران رہ گیا۔ وہ کافی کمزور اور زرد نظر آ رہی تھی۔ آنکھیں چمک سے خالی تھیں' حتیٰ کہ وہ پیشانی بھی ماند نظر آ رہی تھی جس پر ہر وقت ایک دلنشیں شعاع کا عکس جھلملاتا تھا۔ ایک لمحے کے لئے صرف ایک لمحے کے لئے ان دونوں کی نگاہیں ملیں۔ یہ ایک لمحہ محبوب کو ان گنت کہانیاں سنا گیا۔ سارہ نے کچھ نہیں کہا لیکن اس کی آنکھوں نے کہا۔ "آپ نے پھر دیر کر دی محبوب۔" ہاں اس نے یہ بات کہی تھی۔ یہ محبوب کا "زورِ خیال" نہیں تھا۔

محبوب کا خیال تھا کہ وہ اس کے قریب آئے گی۔ کم از کم سلام تو کرے گی لیکن اس کی پہلی جھلک ہی آخری تھی۔ محبوب اس کو عورتوں کے جمگھٹے میں ڈھونڈتا ہی رہ گیا۔

☆==========☆==========☆

وہ بڑی سنسان رات تھی۔ خاموش اور کسی دائمی بیمار کی طرح بے آرام۔ گھر میں آنے والے مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے۔ کسی قریبی کمرے میں اہل خانہ

کی چہکنے والی آوازیں بھی اب نیند کی گہرائیوں میں اتر چکی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ کھڑکی سے جھانکنے والے زرد چاند اور کمرے میں بے چین پھرنے والے زرد رُو محبوب کے سوا کچھ بھی بیدار نہیں۔

"سارہ یہ کیا کر دیا تم نے؟" وہ بے حد کرب کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ "جہاں اتنے برس انتظار کیا تھا چند روز مزید کر لیا ہوتا۔ تم نے اس وقت رخت سفر باندھا جب منزل تمہیں خود ڈھونڈتی ہوئی آ پہنچی تھی۔"

پھر اس کے اندر سے آواز آئی۔ "اب بھی کچھ نہیں بگڑا محبوب! تُو اب بھی وقت کی طناب کھینچ سکتا ہے۔ سارہ تجھ سے والہانہ محبت کرتی ہے۔ خالہ عطیہ نے خود بتایا ہے اب بھی ہر وقت تیری باتیں کرتی ہے' تیرے خیالوں میں رہتی ہے۔ وہ تیری ایک آواز پر ہر رکاوٹ کو عبور کر جائے گی۔ ہر بندھن کو توڑ دے گی۔ اس کی آنکھ سے گرنے والا ایک آنسو خالہ عطیہ کے دل کو چیر ڈالے گا اور دوسرا آنسو خالو رزاق کے سینے میں ہلچل مچا دے گا۔ پھر سب کچھ تم دونوں کے حق میں ہو جائے گا۔ ابھی کچھ بھی نہیں بگڑا ہے محبوب! ابھی سارہ کو اس کی پیشانی کی چمک اور رخساروں کے گلاب واپس مل سکتے ہیں۔ ابھی وہ اتنی دور نہیں گئی کہ تمہارے آنگن میں بہار بن کر نہ آ سکے۔"

لیکن.......... وہ سارہ کو پکارنے کی ہمت کہاں سے لائے گا۔ اس کی فطرت نے اسے مزاج کے جس دائرے میں محصور کر رکھا ہے وہاں سے کیسے نکلے گا۔ کیسے پار کرے گا اپنی حد اختیار؟ وہ بڑی دیر تک سوچتا رہا پھر اس کا ہاتھ بے اختیار ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ سارہ کے گھر میں اب فون بھی تھا۔ اس کا نمبر بھی انڈکس میں لکھا تھا۔ محبوب نے لرزتے ہاتھوں سے نمبر ڈائل کئے۔ تین چار دفعہ گھنٹی بجی پھر کسی نے ریسیور اٹھایا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی ایک کربناک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ ڈھولک کی آواز تھی۔ کسی قریبی کمرے میں ڈھولک بج رہی تھی۔ خالہ عطیہ نے بتایا تھا کہ چار روز بعد سارہ کی منگنی ہے اور ایک ماہ بعد شادی ہے۔ یہ سارہ کی منگنی کی ڈھولک تھی۔ پھر سارہ کی بہن شاہین کی آواز آئی "ہیلو کون.......... ہیلو!"

محبوب نے بولنا چاہا لیکن پھندا سا لگ گیا۔ وہی "نیک نام کم ہمتی" اس پر طاری ہو گئی جو اس کی جان کا روگ تھی۔ وہ کوشش کے باوجود شاہین کی بات کا جواب نہیں دے سکا اور یہ نہیں کہہ سکا کہ وہ سارہ کو بلائے۔ اس نے فون بند کر دیا۔

دوسرے روز گھر میں پھر مہمان آتے جاتے رہے' بچے اودھم مچاتے رہے اور عورتیں دنیا جہان کی باتیں کرتی رہیں۔ ان میں سارہ اور شاہین کی شادی کی باتیں بھی تھیں۔ سارہ کی شادی کوئٹہ کے ایک قریبی قصبے نوشکی میں ہو رہی تھی۔ اس کا متوقع دلہا عمر میں تھوڑا سا بڑا تھا اور درمیانی شکل و صورت کا تھا۔ وہ پراپرٹی ڈیلنگ کرتا تھا۔ محبوب نے اس کی تصویر بھی دیکھی تھی۔ اس کی پیشانی سے بال اڑے ہوئے تھے۔ جسم فربہ تھا اور وہ ہر طرح سے سکہ بند پراپرٹی ڈیلر نظر آتا تھا۔

اس روز نصف شب کے بعد محبوب نے ایک بار پھر سارہ کو فون کرنے کی ٹھانی۔ وہ کتنی ہی دیر عذاب ناک تذبذب کے عالم میں فون کے سامنے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ اس صورت حال کا سامنا کیسے کرے۔ اس کی پوری زندگی میں صرف تین مواقع ایسے تھے جب اس نے اپنی ہمت اور سکت سے بڑھ کر کوئی کام کیا تھا اور ان تینوں مواقع پر کسی نہ کسی سہارے نے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ سب سے پہلا موقع وہ تھا جب وہ راولپنڈی میں تھا۔ اپنے اندرونی ہیجان اور کربناک یورش پر قابو پانے کے لئے وہ بازارِ حسن چلا گیا تھا اور وہاں جاکر ایک سکتہ زدہ شخص کی طرح کھڑا ہو گیا تھا۔ اس وقت اسے ایک ٹھیلے والے نے سہارا دیا تھا اور ہاتھ تھام کر "گندگی کے ایک ڈھیر" پر پھینکا تھا۔

دوسری مرتبہ اس نے غنڈے یاسر سے ملاقات کی تھی۔ اس وقت تیز بخار نے اسے خفقان میں مبتلا کر رکھا تھا۔ دماغ گردش میں تھا اور اس گردش میں اس نے یاسر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔

تیسری مرتبہ اس کا سابقہ سارہ سے پڑا تھا۔ اس کڑی آزمائش میں تاریکی نے اسے سہارا دیا تھا اور تاریکی کے پردے میں اس نے سارہ کو اپنی بانہوں میں لے لیا تھا۔

مگر آج ایسا کوئی سہارا نظر نہیں آرہا تھا۔ نہ ٹھیلے والا' نہ بخار کی مدہوشی تھی نہ تاریکی کی پناہ تھی۔ بس وہ تھا اور سارہ تھی۔ اسے فون کے ذریعے براہ راست سارہ سے بات کرنا تھی۔ پیشانی سے پسینہ پونچھ کر اس نے لرزتے ہاتھوں سے نمبر ڈائل کئے۔ قریباً دو فرلانگ دور سارہ کے گھر میں گھنٹی بجی۔ دوبار.......... چار بار.......... دس بار۔ پھر کسی نے ریسیور اٹھایا۔ "کون ہیلو.......... کون؟" شاہین کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

محبوب نے تھوک نگلا "میں.......... محبوب بول رہا ہوں۔" دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر شاہین کی خوشی سے لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ "محبوب بھاہی جان آپ؟

مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"کس بات کا؟"

"کہ آپ نے.......... آپ نے فون کیا ہے۔ اوہ مائی گاڈ۔ آپ تو پتا نہیں کن ہواؤں میں اڑ گئے ہیں۔ ہم تو ترس گئے ہیں آپ کی آواز سننے کے لئے۔"

محبوب سنجیدگی سے بولا۔ "شاہین! ایک چھوٹا سا کام کردو۔ ذرا سارہ کو بلا دو۔"

"آپ حکم دیں بھاہی جان' مم.......... میں ابھی بلاتی ہوں۔ ایک سیکنڈ۔ آپ ہولڈ کریں' لیکن بند نہ کردیں۔"

پھر قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوا کہ وہ بھاگتی ہوئی دوسرے کمرے میں گئی ہے۔ چند لمحے بعد پھر قدموں کی آواز آئی۔ یہ آواز پہلی آواز سے مختلف تھی۔

محبوب کے دل نے گواہی دی کہ یہ سارہ کے قدموں کی آواز ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہیں اور دل یوں دھڑک رہا ہے جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ جو بات وہ سارہ سے کہنا چاہ رہا تھا وہ بہت "بڑی" تھی۔ بات کے مقابلے میں اس کا حوصلہ بہت چھوٹا تھا۔

"ہیلو۔" سارہ کی جانی پہچانی آواز اس کے کانوں میں پہنچی۔ اس آواز کا سحر اس کی سماعت میں جذب ہو کر پورے جسم میں پھیل گیا۔

اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ وہ ہیلو کہنا چاہ رہا تھا لیکن پھر کوئی چیز گلے میں اٹک گئی تھی۔

"ہیلو۔ میں سارہ بول رہی ہوں۔" آواز پھر اس کے کانوں تک پہنچی۔ محبوب کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔

"ہیلو۔" سارہ نے کہا۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ التجا تھی کہ وہ کچھ بولے۔

محبوب کی پیشانی سے اب باقاعدہ پسینے کے قطرے گر رہے تھے۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر اس خوفناک کشمکش میں گرفتار رہا۔ وہ شرم آلود جھجک' وہ نارسائی اور بے زبانی جو نہ جانے کتنی نسلوں سے اس کے خون میں سفر کر رہی تھی' ایک دم ابھر کر سامنے آگئی تھی..........

پھر یکایک اسے سکون سا آگیا۔ کوئی اچھلتا ہوا سمندر تھا اس کے اندر جو ایکا ایکی شانت ہو گیا۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "ہیلو' سارہ! میں محبوب بول رہا ہوں۔"

"آ......... آپ......... کیسے ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں......... اور تم؟"

"مم......... میں بھی ٹھیک ہوں۔"

"بس تمہاری خیر خیریت پوچھنے کے لئے فون کیا تھا۔"

"جی؟" قدرے حیرت سے پوچھا گیا۔

"اچھا......... معاف کرنا۔ میں نے تمہیں بے آرام کیا۔ خدا......... حافظ۔"

دوسری طرف خاموشی تھی۔ محبوب نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ پھر جھک کر اپنا ماتھا کریڈل پر رکھا۔ چند لمحے خاموش بیٹھا رہا' پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

☆===========☆===========☆

سارہ کی شادی سے ایک ہفتے قبل ہی محبوب واپس سعودیہ پہنچ گیا تھا......... اس کا سینہ غم سے لبریز تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کسی کا دامن ہو اور وہ اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روتا رہے۔ ایسے میں اسے وہ دامن یاد آگیا جو پوری کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔ جس شہر میں محبوب کا ٹھکانا تھا وہاں "شہرِ نبی ﷺ" کو چھو کر آنے والی ہوا چلتی تھی......... وہاں شب کی خنکی میں حرم کی خوشبو سرایت کر جاتی تھی۔ یہ ایسا ماحول تھا جس میں طبع رقیق ہوتی تھی اور دلوں میں گداز جاگتا تھا اور محبوب تو پہلے ہی سر تا پا رقت اور گداز تھا۔ اس کے سینے میں جیسے غم کا ایک پہاڑ سمایا ہوا تھا......... پھر ایک شب اس نے خود کو شہر کی مرکزی جامع مسجد کے سائے میں پایا۔ وہ بلند و بالا مینار کی پرچھائیں پر گر گیا اور اس بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا جو ماں کو اپنے بے پناہ درد سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ کیوں نہ روتا آج سارہ کی شادی کی رات تھی......... وہ آنسوؤں کے دھندلکے میں بلکنے لگا۔ "اے میرے خدا! تُو نے مجھ کو ایسا کیوں بنایا؟ میرے سینے میں جذبات کا سمندر رکھا لیکن میری زبان کو الفاظ نہ دیئے۔ میرے نطق کو وہ تاثیر نہ دی کہ میں دلوں کو متاثر کر سکوں۔ مجھے وہ سمجھ بوجھ' وہ تیزی طراری نہ دی کہ میں دیواروں میں راستے بنا سکوں اور اگر تُو نے مجھے ایسا بنایا ہی تھا یا رب' تو پھر قدیر جیسے زمانہ ساز لوگوں سے میرا واسطہ نہ رکھا ہوتا اور اگر قدیر جیسے لوگوں سے میرا واسطہ رکھا تھا تو پھر میرے دل میں ایسی تمنا نہ پالی ہوتی جسے پورا نہیں ہونا تھا۔ اے میرے رب' میرا کیا قصور ہے۔ میں نے سارہ کو چاہا تھا۔ اپنی طاقت اور اپنے حوصلے کے مطابق میں نے اسے اپنانے کی

پوری کوشش کی مگر میں اتنی صلاحیتیں کہاں سے لاتا کہ اس کوشش کو کامیاب بناتا۔ یہ صلاحیتیں تو تُو نے مجھے عطا ہی نہیں کی تھیں۔ اے مالک' میری چاہت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا' میری نیت میں کوئی کجی نہیں تھی۔ میں ایک سیدھے سادے راستے کا مسافر تھا' پھر مجھے کیوں مات ہوئی۔"

وہ دیر تک روتا رہا۔ اس کے دل کا غبار قدرے ہلکا ہو گیا۔ اس کے ذہن پر چھائی ہوئی دھند کسی حد تک چھٹ گئی۔ وہ سسک کر بولا۔ "میں تجھ سے کوئی شکوہ نہیں کر رہا اے میرے مالک۔ میں کہاں ہوں اس قابل......... میں جانتا ہوں تیرے پاس میرے ہر احمقانہ سوال کا بے مثال جواب موجود ہے۔ میں تو بس یونہی رونے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ تجھے اپنے بندوں کا عاجزی سے سسک سسک کر رونا اچھا لگتا ہے نا' میں اسی لئے رو رہا ہوں۔"

معلوم نہیں کب تک اس پر رقت اور خود ترسی کی وہ ناقابلِ فراموش کیفیت طاری رہی پھر اسے اپنے دل کا بوجھ ہلکا محسوس ہونے لگا۔ اس کے دل پر ایک خیال الہام کی طرح وارد ہوا۔ یہ بات آپوں آپ اس کے دماغ میں سما گئی کہ سارہ ایک خوشی تھی جو اس سے چھن گئی ہے۔ بے شک' فی الوقت اس جان لیوا محرومی کا کوئی مداوا نظر نہیں آتا مگر قدرت کے خزانے لامحدود اور بیکراں ہیں۔

اسے یوں لگا جیسے اس کی سلب شدہ توانائی کا کچھ حصہ اسے واپس مل گیا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دھیرے دھیرے چلتا ایک سنسان گلی کے موڑ پر او جھل ہو گیا۔

☆===========☆===========☆

کافی وقت گزر گیا۔ محبوب کی زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ ایک خاموشی سی اس کے ارد گرد پھیل گئی تھی۔ جیسے ایک شدید طوفانی رات کے بعد ایک چمکیلی صبح کو سمندر کی سطح ہموار اور پُرسکون دکھائی دے۔ اس نے جاں گسل سوچوں کی یلغار سے بچنے کے لئے خود کو اپنے کام میں غرق کر لیا۔ وہ صبح سے رات گئے تک مصروف رہتا۔ پھر جب نیند سے اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگتیں تو اپنا سر تکیے پر ٹکا دیتا۔ وہ گھر والوں کو بھی بہت کم کم خط لکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جتنے زیادہ خط لکھے گا' اتنے ہی زیادہ جواب آئیں گے اور اس بات کا خدشہ بھی اتنا ہی بڑھ جائے گا کہ ان خطوط میں اسے سارہ کا ذکر پڑھنے کو ملے۔ وہ اب سارہ کی طرف سے اپنی حسیات بالکل منجمد کر لینا چاہتا تھا۔ اس کا دل چاہتا

تھا کہ اپنے زخم زخم ماضی کی جھلک بھی اسے نظر نہ آئے۔

☆==========☆==========☆

.... وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ ہفتے مہینوں میں بدلے اور مہینے سالوں میں، محبوب اب سعودیہ میں کافی "اسٹیبلش" ہو چکا تھا۔ کام سے اس کی غیر معمولی لگن رنگ لائی تھی اور وہ اپنی فرم میں کمپیوٹر کے شعبے کا انچارج ہو گیا تھا۔ تنخواہ بھی قریباً سہ گنا ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ دیگر سہولیات بھی حاصل تھیں۔ محبوب کا چھوٹا بھائی عاطف اب جوان ہو چکا تھا۔ وہ پاکستان میں ہی ایم بی اے کر رہا تھا۔ محبوب نے اپنے والدین کو سعودیہ بلا لیا۔ اس کی خواہش تھی کہ عاطف بھی کورس مکمل کر کے سعودیہ چلا آئے۔ وطن کی محبت اپنی جگہ تھی لیکن "محبت کے گھاؤ" بھی اپنی جگہ تھے محبوب کو اپنا وطن پیارا تھا لیکن وطن سے وابستہ یادیں سوہانِ روح تھیں۔ وہ ان یادوں سے بہت دور بہت دور رہنا چاہتا تھا۔

محبوب کی عمر اب قریباً بتیس سال ہو چکی تھی۔ پچھلے آٹھ دس سال سے والدین مسلسل اس پر شادی کے لئے دباؤ ڈال رہے تھے۔ "دباؤ" والی بات پر غور کئے بغیر محبوب نے والدین کو سعودیہ بلا لیا تھا۔ نتیجے کا علم اسے دو تین ہفتے کے اندر ہی ہو گیا۔ والدین اور خاص طور سے والدہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئیں۔ انہوں نے جیسے یہ سوچ لیا تھا "اب یا کبھی نہیں۔" دوسری طرف ان کی معاونِ خصوصی راحت بھی پاکستان سے خط پر خط ارسال کر رہی تھی۔ وہ بار بار محبوب کو دھمکا رہی تھی، اس کے قریباً ہر خط میں یہ فقرہ موجود ہوتا تھا "محبوب! تمہاری ہٹ دھرمی سے امی کو ضرور کوئی نہ کوئی روگ لگ جائے گا۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے ہم سب کے حال پر رحم کرو۔"

.... پھر اکتوبر کی ایک خزاں رسیدہ اداس شام کو محبوب نے اپنے پیاروں کے پیہم اصرار کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ سعودیہ میں مقیم شائستہ نام کی ایک لڑکی اس کی زندگی میں آ کر شائستہ محبوب بن گئی تھی۔ شائستہ ایک بڑی پیاری ہستی تھی۔ شفیق، مہربان اور ہر قسم کے حالات سے سمجھوتا کرنے والی۔ وہ گریجویٹ تھی۔ اس کے والد پچھلے چالیس سال سے سعودیہ میں کاروبار کر رہے تھے۔

بے شک وقت ایک مرہم ہے لیکن مرہم گہری چوٹ پر اثر نہیں کرتے۔ محبوب کے دل کی چوٹ بھی بہت گہری تھی۔ زندگی کی مصروفیت کسی "پین کلر" کی طرح محبوب

کو وقتی افاقہ تو پہنچا دیتی تھی لیکن مستقل افاقہ اس کے نصیب میں ہی نہیں تھا اور شاید وہ ایسا افاقہ چاہتا بھی نہیں تھا۔ یہی درد تو اس کی زندگی کا حاصل تھا۔ نارسائی کا دکھ اس کی سانس کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور ان کہی باتوں کی جاں گسل کسک دھڑکنوں میں سمائی رہتی تھی۔

شادی کے دو سال بعد اس کے ہاں بیٹا ہوا۔ اس کا نام اس نے نازید رکھا۔ نازید شکل و صورت کے اعتبار سے بہت حد تک محبوب پر گیا تھا۔ جب وہ پانچ چھ سال کا ہوا تو اس کی عادات بھی محبوب سے ملتی جلتی پائی گئیں۔

سارہ کے بارے میں محبوب کو کچھ علم نہیں تھا۔ ہزاروں میل کی دوری تھی اور اس دوری سے بھی بڑی رکاوٹ وہ دیوار تھی جو محبوب نے اپنے اور سارہ کے درمیان اپنی مرضی سے اٹھائی تھی۔ وہ زندگی کی آخری سانس تک اس دیوار کو گرانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اپنی والدہ کی زبانی ایک بار بس اتنا معلوم ہوا تھا کہ سارہ کے والدین لاہور ہی میں ہیں۔ سارہ کے دو بیٹے ہیں۔ خاوند اسے بہت خوش رکھتا ہے۔ وہ کبھی کبھار والدین سے ملنے لاہور آ جاتی ہے۔

.... اگلے چار پانچ سال میں محبوب کی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے۔ پہلے اس کے والد اور پھر والدہ فوت ہو گئیں۔ اس کی اہلیہ کے پیٹ میں رسولی تھی، اس کے دو آپریشن ہوئے۔ ان آپریشنز کے نتیجے میں وہ مزید اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ رہی۔ اب اکیلا نازید ہی ان کی زندگی کا محور تھا۔ وہ پڑھائی میں کافی ہوشیار تھا۔ میٹرک کا امتحان اس نے امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ لوگوں سے روابط پیدا کرنے اور بڑھانے میں وہ محبوب ہی کی طرح صفر تھا۔ کم گو، شرمیلا اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا۔ محبوب کو اس میں اپنا عکس نظر آتا تھا لیکن حیرت کی بات تھی کہ بیٹے میں اپنے والی عادات دیکھ اسے خوشی کے بجائے دکھ ہوتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر کڑھ کر رہ جاتا تھا۔ آخر کیوں ہے وہ ایسا؟ وہ ایک دم جھلا جاتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر نازید کو ٹوکتا تھا، ڈانٹتا تھا۔

اس قسم کے فقرے اکثر اس کی زبان سے نازید کے لئے ادا ہوتے رہتے تھے۔

"نیچے کیا دیکھ رہے ہو، سر اٹھا کر بات کرو۔"

"منہ میں گھنگنیاں ڈال رکھی ہیں۔"

"بے وقوف، کم عقل، یہ بھلا کوئی بات ہے عورتوں کی طرح شرمانے کی۔"

اس کی ڈانٹ نازید کو سہما کر رکھ دیتی تھی۔ بعد میں محبوب کو دکھ ہوتا۔ وہ سوچتا' وہ ایسا کیوں کرتا ہے' تربیت کا یہ انداز تو نہیں ہوتا' بچے کی عادات کو آہستہ آہستہ اور بتدریج بدلنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ وہ خود سے عہد کرتا کہ اب نازید کو نہیں ڈانٹے گا۔ ایک دو ماہ اس عہد پر سختی سے کاربند رہتا' لیکن پھر آہستہ آہستہ بھولنے لگتا۔ پھر وہ سوچتا شاید نازید پر اسے جو غصہ آتا ہے وہ اس "رنجش" کا ردِعمل ہے جو اسے اپنی ذات سے ہے' وہ نازید پر غصہ کرکے درحقیقت اپنے آپ پر غصہ اتارتا ہے۔

ایک خیال رہ رہ کر اس کے ذہن میں آیا کرتا تھا۔ کیا وہ اور سارہ اب کبھی نہ مل سکیں گے۔ انہیں کبھی ایک دوسرے کی خبر نہ ہو سکے گی۔ ایک ہی دنیا میں رہتے ہوئے' ایک ہی زمانے میں جیتے ہوئے وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہ پائیں گے؟ ایسے میں اس کا جی چاہتا کہ یہ زندگی کسی "فلم" کی طرح ہو جائے۔ جس میں اچانک کوئی حسین موڑ آجاتا ہے' کوئی انوکھا اتفاق ہو جاتا ہے۔ کہانی پھر وہیں سے شروع ہو جاتی ہے جہاں سے کبھی سلسلہ ٹوٹا تھا لیکن محبوب کی اس سوچ کی عمر بس ایک لمحہ ہی ہوتی تھی۔ بہت جلد وہ ہوش کی دنیا میں واپس آجاتا تھا۔ گزرے ماہ و سال میں گھڑی کی سوئیاں جو فاصلہ طے کر چکی تھیں اسے مٹایا نہیں جا سکتا تھا' نہ ہی وہ پانی واپس آسکتا تھا جو پلوں کے نیچے سے بہہ چکا تھا' یہ فلم نہیں تھی' یہ زندگی تھی۔ اٹل' ٹھوس اور سخت ناہموار۔

ایک مرتبہ نازید اصرار کرکے پاکستان چلا گیا۔ وہ اپنے والدین کی جنم بھومی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ ابو اور امی بھی اس کے ساتھ جائیں لیکن محبوب آمادہ نہیں ہوا تھا۔ نازید کے کالج میں دو مہینے کی چھٹیاں تھیں۔ یہ ساری چھٹیاں اس نے پاکستان میں ہی گزاریں۔ وہ واپس آیا تو بہت خوش تھا۔ پاکستان اسے بہت اچھا لگا تھا اور وہاں کے لوگ بھی۔ اس نے وہاں کے حالات کے بارے میں محبوب کو اور شائستہ کو بہت کچھ بتایا۔

ایک روز وہ محبوب سے کہنے لگا۔

"ابو! یہ سارہ آنٹی کون تھیں؟"

محبوب کے سر پر جیسے بم کا دھماکا ہوا۔ وہ کتنی ہی دیر کھلی کھلی آنکھوں سے نازید کا چہرہ دیکھتا رہا پھر سنبھل کر بولا۔ "وہ کہاں ملی تھیں تجھے؟"

"خالہ انجم کے گھر۔ وہاں میلاد میں آئی ہوئی تھیں۔ میرا نام پوچھا' پھر پیار سے اپنے پاس بٹھا لیا۔ بڑی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ وہ تو سب کچھ جانتی ہیں ہمارے بارے میں۔

سب رشتے داروں' عزیزوں کے نام اور ان کے حالات وغیرہ انہیں معلوم تھے۔ وہ بتاتی تھیں کہ آپ ایک دوسرے کے ہاں اکثر آتے جاتے تھے۔ آپ کا اور امی کا حال احوال بھی پوچھ رہی تھیں۔ بڑے اصرار سے کہنے لگیں کہ میں ان کے گھر آؤں۔ اگلے روز میں ان کے گھر بھی گیا تھا۔"

"ان کے گھر؟" محبوب کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

"میرا مطلب ہے' ان کے والدین کے گھر۔ خود تو شاید وہ کوئٹے میں بیاہی ہوئی ہیں۔ یہاں اپنے بیٹے کو میڈیکل کالج میں داخل کرانے آئی ہوئی تھیں۔ مجھے تو بڑی اچھی لگیں وہ۔ اگلے روز میں ان کے گھر پہنچا تو انہوں نے مجھ سے ڈھیر ساری باتیں کیں۔ بڑی محبت سے کھانا کھلایا۔ چائے پلائی۔ ان کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کہ میں ان کے پاس سے اٹھ کر جاؤں۔ کہنے لگیں۔ "تم مجھے بالکل اپنے بیٹے کی طرح لگے ہو۔ جب میں آنے لگا تو انہوں نے مجھے ایک سویٹر بھی دیا۔ بولیں' یہیں میرے سامنے مجھے پہن کر دکھاؤ۔"

نازید اٹھا اور اس نے اٹیچی سے سویٹر نکال کر محبوب کو دکھایا۔ یہ آستینوں کے بغیر ایک خوب صورت سویٹر تھا۔ محبوب کو یاد آیا کہ اس نے یہ سویٹر پہلے بھی دیکھا ہے۔ بہت برس پہلے.......... بہت موسم پیشتر۔ یہی ڈیزائن تھا' یہ سائز تھا.......... جن دنوں محبوب' قدیر کے کہنے پر راولپنڈی سے لاہور آیا تھا' شاید انہی دنوں یہ سویٹر سارہ نے سلائیوں پر چڑھا رکھا تھا.......... ہاں یہی تھا وہ سویٹر' محبوب نے عینک درست کرکے غور سے دیکھا۔ اس کے بدن میں سنسنی کی لہریں دوڑتی چلی گئیں۔

اس نے سویٹر کو اپنے لرزاں ہاتھوں سے چھوا۔ اس کی انگلیوں نے سارہ کے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔ وہ اکیلا ہوتا تو شاید رو دیتا لیکن اس کا بیٹا اس کے سامنے تھا۔ وہ بکھرنے سے پہلے سنبھل گیا۔ نازید ابھی تک سوالیہ نظروں سے محبوب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اس سوال کا جواب چاہتا تھا جو شروع میں اس نے پوچھا تھا۔ "یعنی کون تھیں یہ آنٹی؟"

محبوب اسے کیا بتاتا وہ کون تھی' کیسے اس کی زندگی میں آئی اور کیسے دور ہو گئی۔ اس نے بیٹے کو صرف اتنا بتایا کہ وہ ان کی محلے دار تھی اور وہ لوگ ایک دوسرے کے گھر میں اکثر آتے جاتے تھے۔

پھر چند ماہ بعد جنوری کی ایک خنک شام کو جب محبوب اپنے گھر کی چھت پر ٹہل رہا

تھا اسے ایک دل ہلا دینے والی اطلاع ملی تھی۔ یہ اطلاع دینے والا اس کا بیٹا ہی تھا۔ وہ تیزی سے چھت پر آیا تھا، کہنے لگا "ابو جان.......... کچھ پتا چلا آپ کو؟"

"کیا ہوا؟" محبوب نے چونک کر پوچھا۔

"وہ سویٹر والی آنٹی فوت ہو گئیں۔"

ایک دم آسمان ٹوٹ کر محبوب کے سر پر آن گرا تھا۔ وہ ہونقوں کی طرح کتنی ہی دیر بیٹے کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اسے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ سارہ کیسے مر سکتی تھی؟ اس سے ملے بغیر، اسے ایک بار چھوئے بغیر؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا، ابھی تو زندگی میں کوئی انوکھا موڑ نہیں آیا تھا۔ ابھی تو دل کی اتھاہ گہرائی میں کسی حسین اتفاق کا انتظار چھپا ہوا تھا.......... وہ کیوں ایک دم سارے امکانات ختم کر گئی تھی۔ یہ کیسا کلائمکس تھا، یہ کیسا ڈراپ سین تھا، اتنا اچانک، اتنا بے ترتیب؟

ایک ہی لمحے میں ان گنت خیالات محبوب کے ذہن سے گزر گئے۔ اس کی نگاہیں بیٹے کے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ اور بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے محبوب کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ بتا رہا تھا۔ "انہیں دل کی تکلیف تھی۔ ایک بار پہلے بھی اٹیک ہو چکا تھا۔ چند روز پہلے دوسری بار اٹیک ہوا۔ وہاں کوئٹہ کے ایک اسپتال میں داخل تھیں۔ حالت زیادہ خراب ہو گئی تو بیٹے سے کہنے لگیں کہ مجھے لاہور لے چلو، میں لاہور میں مرنا چاہتی ہوں۔ بیٹوں نے بہت چاہا کہ وہ سفر نہ کریں لیکن وہ نہیں مانیں۔ لاہور آنے کے بعد چند گھنٹے بعد ہی انہیں پھر دورہ پڑا اور انتقال کر گئیں۔"

محبوب کے ہونٹ مضبوطی سے بھنچے ہوئے تھے لیکن سینے میں انا للہ وانا الیہ راجعون کی صدا گونج رہی تھی۔ وہ بہت خاموشی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بند کمرے میں مصلے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور زار و قطار رو رہا تھا۔

☆==========☆==========☆

محبوب اب ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ رہا تھا۔ وہ تھکا تھکا سا رہتا تھا۔ اس کی سوچوں میں بھی تھکاوٹ اور قنوطیت در آئی تھی۔ وہ زندگی کے بارے میں سوچتا، زندگی کیا ہے۔ شاید ایک تیز رفتار گاڑی۔ جس پر ہم سب اوپر نیچے لدے ہوئے ہیں۔ اونچی اونچی راہوں پر یہ گاڑی اچھلتی کودتی سرپٹ بھاگی چلی جا رہی ہے۔ گاہے گاہے ہمارے ہم سفر شدید دھچکوں کے سبب اس گاڑی پر سے گرتے رہتے ہیں۔ ہم گاڑی روک سکتے ہیں اور نہ نیچے

اتر کر انہیں تھام سکتے ہیں۔ بس حسرت سے انہیں دیکھ سکتے ہیں، لیکن تادیر کچھ دیکھ بھی نہیں سکتے۔ بہت جلد فاصلہ بڑھ جاتا ہے اور بچھڑنے والوں کی صورت نظر میں دھندلا جاتی ہے۔ پہلے بھی کئی لوگ محبوب سے بچھڑ گئے تھے۔ پہلے بہت پیاری دادی، پھر والدہ اور اب سارہ۔ مگر گاڑی حرکت میں تھی۔ اسے حرکت میں رہنا تھا۔

نازید اب اٹھارہ انیس سال کا ہو چکا تھا۔ محبوب کی بھرپور کوشش تھی کہ نازید کا دھیان صرف اپنی تعلیم کی طرف رہے اور وہ ان چکروں سے بچا رہے جو محبوب کو محبت کے خارزار میں لے گئے تھے اور جہاں اس کے جسم و جاں تار تار ہو گئے تھے لیکن انسانی ارادوں کی ناکامی کا نام ہی تو قدرت ہے۔ ایک روز ایکا ایکی محبوب کو اندازہ ہوا کہ نازید پر وہ وقت آ گیا ہے جو ہر نوجوان پر آتا ہے۔ جب آنکھوں میں خواب جاگتے ہیں، ہونٹوں پر گلاب کھلتے ہیں اور چال میں رقص کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ ہاں، نازید ایک لڑکی سے پیار کر رہا تھا۔ وہ جس علاقے میں رہتے تھے وہاں زیادہ تر پاکستانیوں کے گھر تھے۔ خاص طور سے ان کی گلی تو مکمل "پاکستانی" تھی۔ دو تین گھر چھوڑ کر ایک "ایس ایم سالک" صاحب کی کوٹھی تھی۔ وہ نہایت تجربے کار اور پڑھے لکھے الیکٹریشن تھے۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں۔ بڑی دونوں بیاہی جا چکی تھیں، چھوٹی پڑھ رہی تھی۔ اس کا نام سنبل تھا۔ خوب صورت، ہنس مکھ اور تیز طرار لڑکی تھی۔ سعودیہ میں پیدا ہوئی تھی اور یہیں پلی بڑھی تھی۔ اپنے جیسے دیگر نوجوانوں کی طرح اسے اردو بس واجبی سی آتی تھی۔ ہاں انگریزی اور عربی روانی سے بولتی تھی۔ وہ اور نازید ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی محلے کے چند نوجوان تھے جو اس کالج میں پڑھتے تھے۔ ان سب نے ایک گروپ سا بنا رکھا تھا۔ یہ سب ماڈرن گھرانوں کے ماڈرن بچے تھے۔ ان کا اپنا رہن سہن تھا، اپنے مشاغل تھے۔ معاشرتی حوالے سے بیرون خانہ تو اتنی آزادی حاصل نہیں تھی لیکن درون خانہ ان کی تفریحی سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔ کسی برگر فیملی کی طرح وہ لوگ گھل مل جاتے تھے۔ بیڈمنٹن اور ٹینس وغیرہ کے مقابلے ہوتے تھے، کارڈز کھیلے جاتے تھے، وڈیو پر فلمیں دیکھی جاتی تھیں اور ایسے ہی بہت سے مشاغل تھے.......... نازید بھی کبھی کبھار ان دلچسپیوں میں شریک ہو جاتا تھا مگر وہ فطرتاً تنہائی پسند تھا۔

محبوب اور اس کی اہلیہ نے نازید سے اس کے معمولات کے بارے میں کبھی زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی تھی لیکن وہ ان معمولات پر نظر ضرور رکھتے تھے۔ خاص طور سے

محبوب کی نظر تو بہت گہری تھی۔ ویسے بھی بزرگوں سے اپنے بچوں کے محسوسات چھپے تو نہیں رہ سکتے۔ وہ نہ جانتے ہوئے بھی سب کچھ جانتے ہیں۔ محبوب بھی جانتا تھا کہ نازید کے قدم ایک نازک راستے پر پڑ چکے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس راستے پر اور کس کس کے قدم ہیں۔ نوجوان ٹولی سے کافی فاصلے پر ہونے کے باوجود وہ ان کے بارے میں قریباً سبھی کچھ جانتا تھا۔ اس ٹولی میں ایک لڑکا باسط بھی سنبل میں دلچسپی لیتا تھا۔ ٹولی کے دیگر نوجوانوں کی طرح وہ بھی خاصا تیز طرار اور باتونی تھا۔ بلند قہقہے' خوب صورت جملے' حاضر جوابی' یہ سب کچھ اس کی گفتگو میں موجود رہتا تھا۔ جب محبوب کو یہ اندازہ ہوا کہ یہ لڑکا اس کے بیٹے کا رقیب ہے (یا ہو سکتا ہے) تو اس کا دل بجھ سا گیا۔ نہ جانے کیوں اسے پھر وہ تکون یاد آ گئی تھی جو برسوں پہلے لاہور کی ایک شاداب گلی میں سارہ' قدیر اور اس کے اپنے درمیان بنی تھی۔ اسے لگا جیسے وقت خود کو دہرا رہا ہے۔ ایک انجانا سا خوف اس کے دل میں گھر کر گیا۔ کیا اس کے بیٹے کو بھی انہی عذابوں سے گزرنا پڑے گا جن سے وہ گزرا۔ اس کا دل غم و اندوہ میں ڈوب گیا۔ اس کیفیت کے نتیجے میں اس پر جھلاہٹ سوار ہو گئی۔ اسے نازید پر غصہ آنے لگا۔ اسے کیا ضرورت تھی ان بکھیڑوں میں پڑنے کی۔ اس کی تمام توجہ اپنی تعلیم کی طرف ہونی چاہئے تھی۔ وہ کیوں اپنی توانائیاں بے کار کے کاموں میں لگا رہا تھا۔ لیکن پھر اسے اپنے ان سوالوں کا جواب اپنے ماضی سے مل گیا۔ اس عمر میں ایسے حالات میں اس نے خود بھی تو ایسا ہی کیا تھا۔ جب محبوب نے اس انداز سے سوچنا شروع کیا تو اسے نازید سے ہمدردی پیدا ہونے لگی۔ اسے لگا جیسے وہ نازید کے متعلق ایک باپ کی طرح نہیں ایک دوست کی طرح سوچ رہا ہے' ایک ہمراز اور خیر خواہ دوست کی طرح۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے یہ خواہش ابھری کہ نازید اپنی محبت کو پانے میں کامیاب ہو جائے۔ جو خوشی وہ حاصل نہیں کر سکا وہ نازید کو مل جائے۔ وہ غیر ارادی طور پر نازید اور سنبل کے بارے میں غور کرنے لگا۔ ان کے رویوں اور کیفیات پر نگاہ رکھنے لگا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ نازید کو بھی وہی مشکلات درپیش ہیں جو اسے تھیں۔ کم آمیزی اور کم گوئی اس کے آڑے آ رہی تھی۔ وہ ماحول میں گھل مل نہیں پا رہا تھا۔ ایک ویک اینڈ پر جب سارے ہم خیال نوجوان جیپوں پر آؤٹنگ کے لئے گئے تو نازید ان میں شریک نہیں ہوا۔ سنبل اور باسط اسے لینے کے لئے گھر بھی آئے لیکن وہ سر درد کا بہانہ کر کے پڑا رہا۔
چند روز بعد رات کو باسط کے کزن عسابر کے گھر "برتھ ڈے" پارٹی تھی۔ یہ پارٹی رات

دو بجے تک چلتی رہی لیکن نازید دس گیارہ بجے ہی واپس آ گیا۔ اس طرح کے بے شمار واقعات تھے جن سے محبوب کو اندازہ ہو رہا تھا کہ فطری تنہائی پسندی نازید پر غالب آ رہی ہے۔

دوسری طرف باسط قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اکثر سنبل کے ساتھ نظر آتا تھا۔ ایک روز باسط' سنبل اور چند دیگر دوست نازید سے ملنے ان کے گھر آئے' اسٹڈی کے ساتھ والے کمرے میں کیرم بورڈ کی زبردست بازی جمی۔ محبوب اسٹڈی میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ کمرے سے آنے والی بیشتر آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں' وہ لوگ پارٹنر بن کر کھیل رہے تھے۔ باسط کی آواز آئی۔ "سنبل! کس کی پارٹنر بنو گی۔ میری یا نازید کی؟"

"جو بھی بنا لے۔"

باسط تیزی سے بولا۔ "دیکھو بھئی! بات یہ ہے کہ تم کھیلتی ہو فاؤل......... جو فاؤل کھیلتا ہے' اس کا پارٹنر تگڑا ہونا چاہئے تا کہ جھگڑا وغیرہ ڈال سکے۔ نازید تو چپ رہے گا' اکیلے تم کو ہی لڑنا پڑے گا۔ کیا خیال ہے؟"

ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ سنبل نے تنک کر کہا۔ "کون کہتا ہے میں فاؤل کھیلتی ہوں؟"

باسط بولا۔ "میں کہتا ہوں تم فاؤل کھیلتی ہو۔"

"بس تم ہی کہتے ہو۔" نازید نے گفتگو میں حصہ لیا۔

"اور یہ بھی میرا پلس پوائنٹ ہے۔" باسط نے تڑاخ سے جواب دیا۔ "یہ میری پارٹنر ہوئی تو فاؤل پلے کا جھگڑا ہی کھڑا نہیں ہو گا۔"

ایک بار پھر زبردست قہقہہ پڑا۔

سنبل ہنستے ہوئے بولی۔ "ٹھیک ہے بھئی۔ امنِ عامہ کی خاطر میں باسط کی پارٹنر ہوں۔"

معمولی سی بات تھی لیکن محبوب کئی دن اداسی کے سمندر میں غرق رہا۔ اسے لگا ایسے ہی کسی دن نازید کی خاموشی اسے سنبل سے بہت دور لے جائے گی۔ وہ چپ چاپ پسپا ہو جائے گا۔ باسط اس "کھیل" میں بھی سنبل کا پارٹنر بن جائے گا۔

چند ہی روز بعد اسے اپنے اندیشے حقیقت میں ڈھلتے محسوس ہوئے تھے۔ نازید اب

ہمیشہ سے زیادہ خاموش رہنے لگا تھا' اداس' پژمردہ۔ وہ زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارتا' کتابوں سے الجھتا رہتا یا دھیمی آواز میں میوزک سنتا پھر ایک روز محبوب کا کلیجا کٹ کر رہ گیا تھا۔ رات کسی پہر محبوب کی آنکھ کھلی۔ وہ واش روم سے ہو کر باہر نکلا تو نازید کے کمرے سے اسے سسکیوں کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ ٹھٹک گیا اور کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد کھڑکی کی ایک جھری سے اندر جھانکنے لگا۔ اسے نازید دکھائی دیا۔ وہ اپنا سر میز پر ٹکائے ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ کمرے میں بہت مدھم آواز میں المیہ میوزک بج رہا تھا۔

محبوب خاموشی سے اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ اس نے وہ ساری رات سخت اضطراب میں گزاری۔ کبھی اسے نازید پر بے حد ترس آتا اور کبھی شدید غصے سے اس کی کنپٹیاں جلنے لگتیں۔ وہ سوچتا۔ "یہ بے وقوف لڑکا کیوں پڑا ہے ایسے چکر میں۔ پہلے کسی قابل ہو جاتا' کچھ بن جاتا نہ عقل' نہ ہمت' نہ کوئی وصف اور چلا ہے عشق بازی کرنے۔ کسی مصیبت میں پڑے گا اور ہمیں بھی ڈالے گا۔"

صبح سویرے اس نے نازید کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ پریشان حال پہنچا۔ بال الجھے ہوئے' لباس بے ترتیب اور آنکھوں میں رت جگا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" محبوب نے غصے سے پوچھا۔

"کک........ کیا ابو جی۔" وہ سہم کر بولا۔

"جو میں پوچھنا چاہ رہا ہوں وہ تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ یہ کیا چکر چلا رہے ہو تم آج کل؟"

"مم........ میں سمجھا نہیں ابو جی۔" وہ مزید ڈر گیا۔ سمٹ سکڑ کر ایک بچے کی طرح نظر آنے لگا۔

"یہ سنبل کا کیا معاملہ ہے؟"

وہ پیلا پڑ گیا۔ "کچھ بھی نہیں' ابو جی؟"

"جھوٹ بولتے ہو۔" وہ حلق کی پوری قوت سے دہاڑا۔ "جھوٹ بولتے ہو مجھ سے۔" اس کے ساتھ ہی ایک زناٹے کا تھپڑ نازید کے رخسار پر پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر صوفے پر جا گرا۔ محبوب کی آنکھوں کے سامنے طیش کی سرخ چادر تن گئی تھی۔ وہ چیخنے لگا۔ "بہت بڑے ہو گئے تم؟ بہت قابل بن گئے ہو؟ کیا ہے تمہارے پاس' نہ عقل نہ سمجھ نہ کوئی

صلاحیت' دیکھو اپنے ساتھیوں کو' باسط کو' خالد کو۔ کیا ہو تم ان کے مقابلے میں۔ بولو کیا ہو تم........ تمہاری تعلیم پر لاکھوں خرچ کر رہے ہیں' کیا اس لئے کہ تم کمرے میں پڑ کر روتے رہو' برباد ہوتے رہو' ذرا دیکھو جا کر' آئینے میں اپنا حلیہ۔ کیا لگتا ہے کہ تم کسی معقول خاندان کے فرد ہو........؟"

وہ گرج رہا تھا۔ باہر اس کی بیوی شائستہ دروازہ پیٹ رہی تھی پھر وہ دوسرے دروازے سے اندر آ گئی۔ اس نے بپھرے ہوئے محبوب کو بمشکل قابو میں کیا اور آنسو بہاتے نازید کو اپنی پناہ میں لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆==========☆==========☆

نازید کو طمانچہ مار کر محبوب جتنا پچھتایا' اتنا زندگی میں کبھی نہیں پچھتایا تھا۔ وہ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کا جسم غصے اور غم سے پھنک رہا تھا۔ اس نے کتنی کوشش کی تھی کہ نازید اس پُرخطر راستے پر قدم نہ رکھے جہاں خود محبوب کے پاؤں میں بے شمار کانٹے ٹوٹے تھے لیکن اس کی کوشش ناکام ہو گئی تھی' اور اب وہی کچھ ہو رہا تھا جس کا اسے اندیشہ تھا۔ کبھی اسے بیٹے پر بے تحاشا ترس آتا تھا اور کبھی شدید غصہ۔ جس ہاتھ سے اس نے جواں سال بیٹے کو مارا تھا وہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا' اس کا جی چاہتا تھا اسے کاٹ کر پھینک ڈالے۔ کیوں یہ ہاتھ اٹھا تھا نازید پر........ شاید یہ ہاتھ اس نے نازید پر نہیں خود اپنے اوپر اٹھایا تھا........ وہ کبھی بستر پر لیٹ جاتا کبھی قالین پر ٹہلنے لگتا۔ اسے کسی حال میں چین نہیں تھا۔

وہ ساری رات جاگتا رہا تھا' علی الصباح وہ کرسی پر بیٹھا بیٹھا اونگھ گیا۔ وہ خواب اور بیداری کی درمیانی حالت تھی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ کمرا ایک مانوس خوشبو سے مہک گیا ہے۔ یہ برسوں پرانی وہی خوشبو تھی جو وہ سارہ کی قربت میں محسوس کیا کرتا تھا۔ اسے پڑھاتے ہوئے' اس سے باتیں کرتے ہوئے اور اس کے آس پاس گھومتے ہوئے........ پھر اس نے سارہ کا ہیولا دیکھا۔ یہ ہیولا روشنی میں لپٹا ہوا تھا۔ وہی تیس سال پہلے کی سارہ تھی۔ آہو چشم روشن جبیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ محبوب کو اپنے کانوں میں اس کی آواز گونجتی محسوس ہوئی۔ یہ آواز کہیں بہت دور سے لاکھوں کروڑوں میل کے فاصلے سے اس تک پہنچ رہی تھی۔ یہ آواز سارہ کے ہونٹوں سے نہیں نکل رہی تھی' اس کے سراپا سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"بھابی......... جان.......... آپ نے کیوں مارا اسے .... آپ نے مجھے بہت رلایا ہے......... اب تو بس کریں......... خدا کے لئے اب تو بس کریں اب تو ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا میری طرف بھیج دیں..........."

اس کے دل پر چھائے ہوئے غم و غصے کے بادل ایک دم چھٹ گئے۔ اوس سے بھیگے ہوئے نخلستان میں ایک سہانی صبح کا منظر اس کے سامنے تھا۔ نازید کی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے آئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا دل پھر اپنے بیٹے کے لئے دھڑکنے لگا ہے۔ ہاں۔ وہی دل جو بیٹے کا دوست تھا' اس کا ہمراز اور غم خوار تھا۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑ بڑانے لگا۔ "مجھے معاف کردے میرے بیٹے......... مجھے معاف کردے نازید۔"

☆=========☆=========☆

کچھ دیر گھنٹی ہوتی رہی پھر کسی نے ریسیور اٹھایا "ہیلو۔" زندگی سے بھرپور ایک خوب صورت آواز سنائی دی۔

"میں انکل محبوب بول رہا ہوں سنبل بیٹی!" محبوب نے کہا۔

"اوہ انکل آپ۔" وہ چہکی۔ "آج آپ نے کیسے یاد کرلیا؟"

"بھئی! وہ تم نے کہا تھا ناں کہ میرا کمپیوٹر ڈپارٹمنٹ دیکھنا چاہتی ہو۔"

"واؤ۔" وہ خوشی سے چہک کر بولی۔ "تو آپ لے جارہے ہیں مجھے دکھانے؟"

"بیٹے! اسی لئے تو فون کیا ہے۔ اگر کوئی اور ضروری کام نہیں تو پاپا سے پوچھ لو اور نو بجے تک چلی آؤ۔ یہاں سے اکٹھے ہی چلیں گے۔"

"اوہ سویٹ انکل......... یو آر گریٹ......... بس میں ابھی ناشتا کرکے آپ کے پاس پہنچ جاتی ہوں۔"

"پاپا سے پوچھ لینا۔"

"سمجھ لیں پوچھ لیا میں آرہی ہوں ابھی ایک گھنٹے کے اندر اندر۔"

.... محبوب' سنبل کو لے کر دس گیارہ بجے کے قریب اپنے آفس پہنچا۔ سنبل کمپیوٹر سائنس پڑھ رہی تھی۔ کمپیوٹرز میں اس کی دلچسپی فطری بات تھی۔ محبوب کے ڈپارٹمنٹ میں کچھ نیا "ہارڈ ویئر" آیا تھا۔ سنبل اسے دیکھنے سمجھنے میں بھی دلچسپی رکھتی تھی۔ وہ جینئس لڑکی تھی اور بے حد زود فہم بھی۔ محبوب اس کی ان صلاحیتوں کا معترف

تھا۔ اس نے سنبل کو اپنے ڈپارٹمنٹ کا وہ حصہ دکھایا جہاں نئی مصنوعات رکھی گئی تھیں۔ دو ڈھائی گھنٹے انہوں نے دلچسپ مصروفیت میں گزارے۔

سنبل تو سارا ڈپارٹمنٹ دیکھنا چاہتی تھی لیکن محبوب نے کہہ سن کر اسے باز رکھا۔ اس نے سمجھایا۔ "بیٹا جی! اتنا ہی کھانا چاہئے جتنا ہضم ہوسکے۔ جو کچھ آج دیکھا اور محسوس کیا ہے اسے ذہن نشین کرو' پھر مزید دیکھ لینا۔"

"تو اب کیا کریں گے......... گھر واپس چلیں گے؟"

"نہیں بھئی! آج تم ہماری مہمان ہو۔ یہاں پاس ہی شاندار مصری ریستوران ہے۔ وہاں ہم اپنی بیٹی کو زبردست لنچ کرائیں گے' پھر واپس چلیں گے۔"

سنبل کھل اٹھی۔

آدھ پون گھنٹے بعد محبوب کی سبک گام مرسڈیز "الناصر ریستوران" کے سامنے رکی۔ محبوب اور سنبل گاڑی سے اترے اور ڈائننگ ہال کے ایک نہایت پرسکون نیم تاریک گوشے میں جا بیٹھے۔

سوپ کا چمچ لیتے ہوئے محبوب نے کہا۔ "سنبل بیٹی! میں تم سے بہت بڑا ہوں۔ جو بات تم سے کرنا چاہتا ہوں' وہ مجھے زیب نہیں دیتی لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں۔ کیا میں امید کروں کہ میری بیٹی مجھ سے ناراض نہیں ہوگی۔"

"انکل! آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ میں بھلا آپ سے ناراض ہوسکتی ہوں۔ آپ میرے بڑے ہیں۔"

محبوب نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "نازید! تمہیں کیسا لگتا ہے؟"

سنبل کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ سوپ کا چمچ اس کے ہاتھ میں ڈگمگایا تھا۔

"مم......... میں سمجھی نہیں انکل۔" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

"میں نے پوچھا ہے کہ نازید' تمہیں کیسا لگتا ہے۔"

وہ ذرا سنبھل کر بولی۔ "بہت اچھا ہے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا' ذہین' خاموش طبع اینڈ ویری ویری جینٹل۔"

"لیکن میرا سوال اپنی جگہ ہے سنبل! اسے کس نظر سے دیکھتی ہو۔ کیا وہ تمہیں اچھا لگتا ہے؟"

سنبل کے چہرے پر پھر رنگ لہرا گیا۔ لاکھ ماڈرن سہی لیکن تھی تو لڑکی۔ اس کا سر غیر

محسوس طور پر جھک گیا۔ اپنی انگلیوں سے بالوں کو پیچھے ہٹا کر بولی "مم.......... میں نے کبھی اس بارے میں سوچا نہیں انکل.......... اور نہ ہی کبھی.......... اس نے کوئی بات کی ہے.........."

"اس نے کبھی کوئی بات نہیں کی؟"

"نہیں انکل۔" وہ معصومیت سے بولی۔

پھر شاید اسے احساس ہوا تھا کہ وہ غیرارادی طور پر کچھ تسلیم کر رہی ہے۔ اس کا سرخ چہرہ حیا کی وجہ سے کچھ اور سرخ ہو گیا۔

محبوب نے ایک بہت گہری سانس لی اور کرسی کی پشت سے کمر ٹکا دی۔ کھوئے ہوئے سے لہجے میں بولا۔ "سنبل! میں آج تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ یہ کہانی میں نے اس سے پہلے کسی کو نہیں سنائی۔ شاید تمہیں بھی نہ سناتا لیکن ابھی تم نے جو جواب دیا ہے اس نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں یہ کہانی سناؤں۔"

سنبل حیران حیران سی محبوب کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں سوال تھے۔

محبوب اپنے سامنے خلا میں جھانک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کہیں بہت دور ماضی کی ایک بھولی بسری گلی میں بھٹک رہی تھیں۔ وہی گلی جس میں سارہ کا گھر تھا اور جہاں محبوب اپنے والدین کے ساتھ "عارضی مکین" کی حیثیت سے ٹھہرا تھا۔ اس نے اپنی کہانی یوں شروع کی۔ "سنبل! اس کا نام سارہ تھا۔ وہ ہمارے سامنے والے مکان میں رہتی تھی۔ وہ بڑی اچھی لڑکی تھی۔"

جوں جوں محبوب کی کہانی آگے بڑھتی گئی' سنبل اس میں کھوتی چلی گئی۔ اس کا اضطراب' جھجک' الجھن سب کچھ کہانی کے پیچ و خم میں ڈوب گیا۔ کبھی اس کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھنچ جاتے' کبھی اس کی آنکھیں اداس ہو جاتیں۔ محبوب کے احساسات کو چھو کر کہانی اس کی نادانیوں تک پہنچی اور پھر اس کی بے زبانیوں سے ہوتی ہوئی اس کی بیکراں محرومیوں تک آ گئی۔ جب کئی برسوں پر محیط یہ روداد اختتام پذیر ہوئی تو شوخ سنبل کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی..........

وہ کراہ کر بولی۔ "انکل محبوب! میں نے خاموش محبت کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن آج پتا چلا کہ خاموش محبت کیا ہوتی ہے۔ سچ انکل! مجھے آنٹی سارہ پر اور آپ پر بے تحاشا ترس آ رہا ہے۔ اِف یو ڈونٹ مائنڈ پلیز.......... آئی وانٹ ٹو سے۔ آئی ایم ویری

ویری سوری.........."

"یعنی تمہارے نزدیک میں قابل رحم ہوں۔"

"جی انکل۔" اس نے آنسو چھپانے کے لئے سر جھکا لیا۔

محبوب نے انگلی سے سنبل کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔ "میری طرف دیکھ کر بات کرو بیٹی! کیا میں قابل رحم ہوں؟"

سنبل نے ہونٹ بھینچ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

محبوب نے کہا۔ "میری طرح کا ایک "قابل رحم" اور بھی ہے۔ تمہیں پتا ہے وہ کون ہے؟" پھر خود ہی بولا۔ "وہ میرا بیٹا ہے۔"

"جی!" سنبل کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"ہاں بیٹی! وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ ویسی ہی محبت جیسی میں نے سارہ سے کی تھی۔ میری طرح وہ بھی متذبذب رہتا ہے۔ اسے بھی اظہار کا ڈھنگ نہیں آتا۔ وہ سالہا سال کوشش کرتا رہے گا تو بھی تم پر اپنے دل کا حال نہیں کھول سکے گا۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا سنبل! چاہے اس کے سامنے کوئی شاطر اس کی آرزو اس سے چھین لے.......... میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں.......... وہ کوئی اور نہیں ہے.......... وہ میں ہی ہوں سنبل.......... سمجھو کہ میں ہی ہوں۔"

جذبات کی شدت سے محبوب کی آواز رندھ گئی۔ وہ بولا۔ "سنبل بیٹی! وہ قابل رحم ہے تو اس پر رحم کرو۔ اگر تمہارے دل میں اس کے لئے کوئی جگہ ہے تو خود اس کی طرف بڑھ جاؤ' اس کا انتظار مت کرو۔ وہ نہیں آئے گا۔ وہ نہیں بولے گا۔ ہم ایک ہی بے زبان قبیلے کے فرد ہیں' ایک جیسی نارسائیاں ہمارا مقدر ہیں۔ جو کل میرے ساتھ ہوا تھا وہ اب نازید کے ساتھ ہو گا.......... لیکن تم چاہو تو اس "ہونی" کو ٹال سکتی ہو.......... اگر تم چاہو تو.........."

دو آنسو بے اختیار محبوب کے رخساروں پر لڑھکے اور اس کی چھوٹی چھوٹی نیم سفید داڑھی میں او جھل ہو گئے۔ سنبل یک ٹک اس کی طرف دیکھتی جا رہی تھی۔

☆=========☆=========☆

وہ ایک خوش رنگ شام تھی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ محبوب نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر پورچ میں جھانکا۔ سنبل' نازید کو لے کر گاڑی میں سوار ہو رہی تھی۔ سنبل

کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے گلاب کھلے تھے۔ نازید کا چہرہ بھی مسرت سے تمتما رہا تھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا' سنبل اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ سنبل نے کوئی چنچل بات کہی۔ نازید بے اختیار مسکرانے پر مجبور ہو گیا گاڑی نے حرکت کی اور ہموار فرش پر بے آواز پھسلتی باہر نکل گئی۔

محبوب کتنی ہی دیر اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ آج اس کے دل کا موسم عجیب سا ہو رہا تھا۔ ایک عمر بیت گئی تھی اور آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پاکستان واپس جائے۔ اپنے شہر کو دیکھے' اپنے گلی کوچوں کو دیکھے اور اس گلی کو بھی جو دنیا میں دو جگہ آباد تھی' ایک زمین پر' ایک اس کے دل میں۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتا الماری کے پاس پہنچا۔ وہ سویٹر جو نازید کئی ماہ پہلے لاہور سے لایا تھا' اب محبوب کے پاس تھا۔ نازید اور شائستہ دونوں کا خیال تھا کہ یہ سویٹر محبوب کو زیادہ اچھا لگتا ہے۔ محبوب نے سویٹر الماری سے اتارا' کچھ دیر اس پر ہاتھ پھیرتا رہا' اس کی خوشبو لیتا رہا' پھر اس نے سویٹر پہن لیا۔ کوئی لامتناہی فاصلوں پر ہونے کے باوجود ایک دم اس کے قریب آگیا' اس کی رگ جاں سے لگ گیا۔ یہ سویٹر شاید بھیجا ہی اس کے لئے گیا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ کھڑکی کے پٹ ہٹا کر دور مشرق کی طرف دیکھنے لگا۔ اپنا وطن اور اپنی "گلی" دیکھنے کی خواہش اس میں شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔

☆========☆========☆

بوڑھا شباب

ایک ایسے نوجوان کی داستان جو ایک حسین اداکارہ کے جلووں کا اسیر ہو گیا تھا۔ اس کا تجسس اسے آگے ہی آگے لے جاتا رہا۔
جب اسے ہوش آئی تو وہ سب کچھ گنوا بیٹھا تھا۔
وہ اپنی بربادی کا انتقام لینے نکلا تھا۔ مصنوعی جلووں کے سحر میں گرفتار ہو کر تباہ ہونے والے نوجوان کی دل گداز داستان

اشرف تیرہ سال کا تھا۔ تیرہ سال عمر ہی کتنی ہوتی ہے۔ ابھی تو اس کے بالائی ہونٹ کے اوپر سیاہی بھی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ ہاں دیہاتی آب و ہوا اور خالص خوراک کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے تھوڑا سا بڑا نظر آتا تھا۔ وہ آٹھویں میں پڑھتا تھا مگر اپنے گاؤں سے لاہور آنے کے بعد اسے ساتویں میں داخلہ ملا تھا اور وہ بھی بڑی مشکل سے۔ لاہور نے اشرف کو بے حد متاثر کیا تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے وہ اپنے گھر کے جستی ٹب میں نہاتے نہاتے ایک بڑے دریا میں تیرنے لگ پڑا ہے۔ وہ لاہور کی وسعت' اس کی رنگینی اور گہما گہمی کو حیرت سے دیکھتا تھا اور حیران تر ہوتا تھا۔ جیسے اچانک بلی کا کوئی بچہ کسی تاریک گوشے سے نکل کر کھچا کھچ بھرے ہوئے ایک بہت بڑے اسٹیڈیم میں پہنچ جائے اور گراؤنڈ کے وسط میں پہنچ کر تعجب سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ اسے لاہور بڑا دلچسپ لگا تھا' وہ روز بہ روز اس میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے حال میں اتنا مگن ہوتا تھا کہ اپنے جان سے پیارے ماموں ارشاد اور ان کی جان سے پیاری بیٹی تارا کو بھی بھول جاتا تھا۔ اشرف اور تارا بچپن سے اکٹھے کھیل کر بڑے ہوئے تھے دونوں میں بے پناہ انس تھا۔ ابھی وہ دونوں عمر کی اس حد تک نہیں پہنچے تھے کہ اس انس کو کوئی اور نام یا رنگ دیا جا سکتا تھا پھر بھی وہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم تھے۔ گاؤں میں دونوں گھرانے پاس پاس رہتے تھے بلکہ دیوار سے دیوار ملی ہوئی تھی لیکن یہاں لاہور میں ماموں کو جو گھر ملا تھا' وہ ڈیڑھ دو فرلانگ کی دوری پر تھا۔ یہ دوری کچھ بھی نہیں تھی پھر بھی شروع شروع میں اشرف کو اور اس کے گھر والوں کو بری طرح محسوس ہوئی تھی۔

لاہور آ کر اشرف کے نئے نئے دوست بنے تھے۔ ان میں کچھ اسکول کے تھے اور کچھ گلی محلے کے۔ دو تین دوست تو بلا تردد اس کے گھر بھی آتے جاتے تھے۔ اشرف چونکہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اس لئے کافی لاڈلا بھی تھا۔ جب اشرف اپنے کسی دوست کو گھر میں لاتا تو امی اس کی خوب خاطر مدارات کرتیں۔ اس کی بڑی بہن

عارفہ بھی اشرف کے خوب لاڈ اٹھاتی تھی۔ اشرف کے خاص دوستوں میں جہانگیر نامی لڑکا ان کا محلے دار بھی تھا' اس کے ابو وکیل تھے۔ وہ خاصا تیز و طرار اور باتونی لڑکا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ اشرف کا سب سے قریبی دوست بن گیا تھا۔ بیشتر وقت وہ اشرف کے گھر میں گھسا رہتا تھا یا پھر اشرف اس کے گھر میں موجود پایا جاتا تھا۔

لاہور آ کر اشرف کو گھومنے پھرنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ تجسس تو اس کی طبع میں شروع سے ہی بہت تھا۔ وہ ہر چیز کو کھوجنا چاہتا تھا۔ وہ جلد سے جلد اس کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کی اسی عادت کو دیکھتے ہوئے اس کے ماموں ارشاد نے پیش گوئی کی تھی کہ وہ آرٹس کے بجائے سائنس کی طرف جائے گا اور خوب پڑھے لکھے گا۔ نئی نئی چیزوں کو کھوجنا سائنس ہی تو کہلاتا ہے۔ اس اعتبار سے اشرف کو لاہور میں ہر طرف سائنس ہی سائنس نظر آتی تھی۔ چھٹی کے دن امی اور آپا سے کرکٹ میچ کا بہانہ بنا کر اکثر وہ اکیلا ہی لاہور گھومنے کے لئے نکل جاتا۔ دریائے راوی' شالا مار باغ' مقبرہ جہانگیر' شاہی قلعہ' شاہی مسجد اور پھر لاہور کا اندرون' بھری پُری گلیاں' پکوان' پتنگیں' دنگل' محفلیں' کھیل تماشے۔ وہ ایک ایک شے پر غور کرتا اور انسانوں کے اس سمندر میں ڈوب سا جاتا۔

کبھی کبھی جب وہ اس گہما گہمی اور رونق سے تھک سا جاتا تو کسی باغ کے پُرسکون کونے میں اکیلا ہی کسی پتھریلی بینچ پر لیٹ جاتا اور ایسے میں اچانک ہی اسے اپنا گاؤں' اس کی خاموشی اور بے تکلفی یاد آ جاتی۔ ظاہر ہے کہ ماضی اتنی جلدی تو انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ یادیں کیسی بھی ہوں' محو ہوتے ہوتے کچھ دیر تو لگتی ہے۔ وہ گاؤں کے تصور میں کھو جاتا۔ ان کا گاؤں "رنگی" پسرور سے کچھ فاصلے پر ایک بڑے ڈیک نالے کے قریب واقع تھا۔

اشرف کے قریبی عزیزوں کے سات آٹھ گھرانے رنگی گاؤں میں آباد تھے۔ ان ہی میں اشرف کے ماموں ارشاد کا گھرانا بھی تھا۔ اشرف کے والد قدرت اللہ صاحب خالص مذہبی ذہن کے آدمی تھے۔ وہ بچوں کو اسکول بھیجنے کے قائل نہیں تھے۔ اشرف کی دو بڑی بہنیں تو اسکول گئی ہی نہیں تھیں' تاہم بعد میں ماموں ارشاد کے سمجھانے اور کہنے سننے سے انہوں نے باقی بچوں کو اسکول بھیجا تھا۔ گاؤں میں اشرف کے والد اور چچاؤں کی زرعی زمین تھی اور کشائش کے ساتھ گزر بسر ہو رہی تھی۔ ماموں ارشاد محکمہ انہار میں ملازم تھے' اور تھوڑی بہت زمین ان کی بھی تھی۔ گاؤں کی کئی سنہری یادیں اشرف کے ذہن پر

نقش تھیں اور انہیں ہمیشہ نقش رہنا تھا۔ گرما کی طویل دوپہروں میں اپنی ماموں زاد طاہرہ عرف تارا کے ساتھ چپکے سے گھر سے فرار ہو جانا۔ باغوں میں گھومنا' کچے پکے پھل توڑنا۔ کنوؤں کے ٹھنڈے ٹھار پانیوں میں پاؤں ڈبو کر بیٹھنا اور مستی میں آکر ایک دوسرے پر چھینٹے اڑانا۔ راتوں کو چھت پر سفید چادروں والی چارپائیوں کی قطاریں اور ٹمٹماتے تاروں کے نیچے ماموں ارشاد کی رس بھری کہانیاں۔ ماموں انہیں تاریخی داستانوں سے اقتباسات سناتے۔ سکندر اعظم' زوال بغداد' فتح اندلس اور پھر آخری چٹان۔ کہانی کے کردار طاہر اور صفیہ اور قاسم......... اور تاتاریوں کی تباہ کاریاں۔ وہ سنتے سنتے کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتے۔ دور کہیں کھیتوں میں ٹریکٹر چلنے کی آواز آتی' تاریکی میں پرندے سرسراتے ہوئے ان کے سروں پر سے گزر جاتے اور دور اوپر دیکھنے پر انہیں یوں لگتا کہ چاند تارے بھی ماموں کی داستان کے سحر میں گم ہیں۔

تارا اور اشرف شروع سے ہی بہت بے تکلف تھے۔ دو سال پہلے تک تو وہ باقاعدہ ایک دوسرے سے کشتیاں کیا کرتے تھے۔ اب خیر کشتیاں تو نہیں ہوتی تھیں مگر ہاتھا پائی اور دھینگا مشتی چلتی رہتی تھی۔ اگر ان دونوں میں سے ایک کو کہیں جانا پڑ جاتا تھا تو دوسرا گمشدہ گائے کی طرح اداس پھرتا تھا۔ آپا کبھی کبھی اشرف کو چھیڑتے ہوئے کہتی تھیں "اشرفی! اتنا مت پھرا کر اس کے ساتھ۔ ورنہ یہ تیرے پلے بندھ جائے گی۔"

"پلے بندھنا" کا مطلب شروع شروع میں تو اشرف کو معلوم نہیں تھا مگر اس کی متجسس طبع نے بہت جلد امی سے معلوم کر لیا تھا اور جب یہ مطلب اسے معلوم ہوا تھا' بہت دن تک اس کے اندر میٹھی میٹھی سی گدگدی ہوتی رہی تھی۔ اس نے ایک روز گاؤں کے کھیتوں میں یونہی پگڈنڈیوں پر آوارہ گھومتے ہوئے تارا کو بتایا تھا کہ "پلے بندھنا" کا مطلب کیا ہوتا ہے اور یہ بات آپا نے کس حوالے سے کی تھی۔ تارا چھوٹی سی تھی مگر پھر بھی وہ شرمائی شرمائی نظر آئی تھی۔ اشرف کو ایک دم دھکا دے کر وہ شرارت سے ہنستی ہوئی بھاگ گئی تھی۔ اشرف پانی لگے کھیت میں گرا تھا اور کیچڑ سے لت پت ہو گیا تھا۔ بعد میں اس نے تارا کو ماسی عائشہ کے تندور کے سامنے جا دبوچا تھا اور اسے زمین پر گرا کر بہت سا کیچڑ اس کے منہ اور سر پر پوت دیا تھا۔

رنگی گاؤں کو ڈیک نالے کی وجہ سے ہر سال خطرہ لاحق ہو جاتا تھا۔ اس برسات میں بڑا شدید سیلاب آیا تھا۔ چار روز تک وہ لوگ چھتوں اور اونچی جگہوں پر پناہ گزیں رہے

تھے۔ آٹھ دس افراد کی ہلاکت کے علاوہ سینکڑوں مویشیوں کا نقصان بھی ہوا تھا۔ فصلیں برباد ہو گئی تھیں اور گھر منہدم ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ پوری زندگی درہم برہم ہو کر رہ گئی ہے۔ اس سیلاب نے اس خیال کو ایک دم توانا سوچ کی شکل دے دی تھی جو کئی برسوں سے اشرف کے بزرگوں کے ذہنوں میں پنپ رہا تھا۔ انہوں نے لاہور آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دو تین ماہ کے اندر ہی سارے انتظامات ہو گئے تھے۔ تھوڑی سی زمین کے علاوہ باقی سب بیچ دی گئی تھی۔ قدرت اللہ نے لاہور کی ایک متوسط آبادی گلزار ٹاؤن میں دس مرلے کا ایک بنا بنایا مکان لے لیا تھا' اور ایک دوست کے ساتھ مل کر چاولوں کا سیل ڈپو بنا لیا تھا۔ اس کام میں انہیں تھوڑا بہت تجربہ بھی تھا۔ قدرت اللہ کے علاوہ ان کی برادری کے تین چار اور گھرانے بھی لاہور منتقل ہوئے تھے ان میں اشرف کے ماموں ارشاد اور چچا رشید وغیرہ شامل تھے۔

انہیں لاہور میں آئے ہوئے اب پانچ چھ ماہ ہونے کو آئے تھے۔ لاہور اور کراچی جیسے دریا دل شہر اپنے اندر بہت کچھ جذب کر لیتے ہیں اشرف اور اس کے عزیز بھی آہستہ آہستہ یہاں جذب ہو رہے تھے۔

لاہور کے تہوار اشرف کو خاص طور سے بہت پسند آئے تھے۔ یوں تو یہ تہوار وہ گاؤں میں بھی مناتا رہا تھا لیکن لاہور میں ان کا مزہ اور رنگ ڈھنگ ہی کچھ اور ہو گیا تھا۔ اسی طرح لاہور آکر وہ ٹی وی اور فلم وغیرہ سے بھی آشنا ہوا تھا۔ گاؤں میں ان کے گھر ٹی وی نہیں تھا۔ تاہم ایک دو گھروں میں تھا اور وہ اپنے چچا زاد بھائیوں کے ساتھ چپکے چپکے جا کر دیکھ بھی آتا تھا' لیکن یہاں لاہور میں تو ہر در و دیوار کے ساتھ ٹی وی نظر آ رہا تھا......... اور ٹی وی بھی ایسا کہ الاماں۔ ڈش کے ذریعے ان گنت چینل آتے تھے۔ اس کے علاوہ وی سی آر پر بھی ہر رنگ کی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ گلزار ٹاؤن میں ہی دو تین ایسے ہوٹل تھے جن پر چائے کی ایک پیالی پی کر فلم یا گانے دیکھے جا سکتے تھے۔ یہی صورت حال فلموں کی تھی۔ گاؤں میں رہتے ہوئے صرف دو بار اشرف نے فلم دیکھی تھی۔ دونوں دفعہ اشرف کے ماموں اسے لے کر گئے تھے۔ ایک دفعہ تحریک پاکستان کے پس منظر میں بننے والی فلم خاک و خون تھی اور دوسری مرتبہ ایک گھریلو قسم کی سلجھی ہوئی فلم تھی مگر یہاں لاہور میں تو ایک ساتھ درجنوں فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ سینما گھروں سے باہر ایسے ایسے پوسٹر لگے ہوئے ہوتے تھے کہ دیکھو تو بس دیکھتے ہی رہ جاؤ۔ ان پوسٹروں میں

فلمی پریاں اپنی پوری آب و تاب سے چمکتی دمکتی نظر آتی تھیں۔

ایسی ہی فلمی پریوں میں سے ایک پری خاص طور سے اشرف کے دل پر لگی تھی۔

غالباً لاہور آکر اشرف نے جو پہلی فلم دیکھی تھی وہ اسی پری کی تھی۔ اس فلم میں اس ارمان نامی پری کا کردار ایک ایسی شریف اور شرمیلی لڑکی کا تھا جو بدقماشوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے' وہ اسے بازار حسن میں بیچ دیتے ہیں' وہاں اسے بے ہودہ ڈانسر بنا دیا جاتا ہے۔ آخر کار لڑکی کا چاہنے والا اسے ڈھونڈتا ہوا اس کلب میں پہنچتا ہے جہاں وہ لڑکی ہر رات نیم عریاں رقص پر "مجبور" کی جاتی ہے۔ وہ ایک خون ریز لڑائی کے بعد اسے بدقماشوں کے چنگل سے چھڑاتا ہے اور شریفانہ زندگی میں واپس لے آتا ہے۔

اشرف کو ارمان کا یہ کردار بڑا پسند آیا تھا' اس نے کئی بار یہ فلم دیکھی۔ وہ جب بھی اسے پردہ اسکرین پر ڈانس کرتے ہوئے دیکھتا اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگتا۔ پیٹ میں وہی مانوس گدگدی ہوتی جو ایک مرتبہ تب ہوئی تھی جب اسے "پلے باندھے جانے" کا مطلب معلوم ہوا تھا۔

ایک روز جہانگیر اس کے گھر آیا' تو اس نے جہانگیر سے کہا۔ "آؤ تمہیں ایک شے دکھاؤں۔"

"کوئی کھانے والی چیز ہے؟" جہانگیر نے پوچھا۔

"کھانے والی تو نہیں لیکن تیرا کھانے کو دل چاہے گا۔"

وہ جہانگیر کو لئے دو منزلہ مکان کی چھت پر چلا گیا۔ اتفاقاً چھت خالی تھی۔ اشرف نے بستہ کھولا اور حساب کی کاپی نکال لی۔

"اوئے کیا مجھے حساب پڑھائے گا؟" جہانگیر بدک کر بولا۔

"تجھے تیرے بڑے نہیں پڑھا سکے' میں کیسے پڑھا سکتا ہوں۔" اشرف نے جواب دیا۔

اشرف نے کاپی کھولی اور اس کے خاکی کور کے اندر سے اخباروں کے کئی تراشے نکال لیے۔ یہ سب کی سب فلمی اداکارہ ارمان کی تصویریں تھیں۔ کہیں وہ ڈانس کر رہی تھی کہیں نیم عریاں لباس پہنے اپنے ہیرو کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ ہیرو اور ہیروئن کے درمیان اخبار والوں نے سیاہ مارکر سے لائن سی کھینچ دی تھی۔ اشتہار پر تو ایسی لائن کھینچی جا سکتی ہے مگر ذہن پر نہیں۔ ذہن تو ایسے موقعوں پر مٹانے والا ربڑ بن جاتا ہے اور ہر

ایسی لائن کو لمحوں میں صاف کر دیتا ہے۔ ایک تصویر میں ارمان کسی تالاب میں سے نکلی تھی اور اس کے سیمیں بدن سے پانی ٹپک رہا تھا۔

"اوئے باندر! یہ تصویریں تیرے ابو نے دیکھ لیں تو تجھے گھر کے دروازے کے سامنے مرغا بنا دیں گے۔" جہانگیر نے کہا۔

"دیکھیں گے کیسے۔ دو مہینے سے یہاں پڑی ہوئی ہیں۔" اشرف نے کہا۔

"ویسے یار! یہ ہیروئن ہے بڑی کڑاکے دار۔ جس فلم میں ہو ایک دم ہٹ ہو جاتی ہے۔"

"ہٹ ہو جاتی ہے؟ کیا مطلب؟"

"یار! تم نرے پینڈو ہی رہو گے' ہٹ کا مطلب ہے کہ فلم ایک دم مشہور ہو جاتی ہے۔ ابھی دو دن پہلے میرے بھائی جان وڈیو پر اس کی ایک فلم لائے تھے' اس میں میں............"

جہانگیر بولتے بولتے ایک دم رک گیا۔ اس کا رنگ لال ہو گیا تھا اور آنکھوں میں شرارت ابھر آئی تھی۔ دائیں بائیں دیکھ کر اس نے اپنا منہ اشرف کے کان کے پاس کیا اور سرگوشی کی۔ اس سرگوشی کو سن کر اشرف کے گال بھی گلابی ہونے لگے۔

وہ پہلو بدل کر بولا۔ "لیکن یار! فلم میں تو ایسے "پاٹ" کرنے ہی پڑتے ہیں۔ ماموں کہتے تھے کہ ایکٹر وہی کرتے ہیں جو فلم کا مالک کہتا ہے۔"

"مالک نہیں یار! اسے ہدایت کار بولتے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ ہدایت کار۔ جو بات تم نے بتائی ہے وہ ضرور اس نے ہدایت کار کے کہنے پر ہی کی ہو گی۔"

"اوئے باندر! تُو نے ابھی کچھ نہیں دیکھا ہے شہر میں' تجھے پتا ہی نہیں ہے یہاں کیسے کیسے چکر چلتے ہیں۔ اب تُو ارمان کی بات کر رہا ہے نا؟ تیرا خیال ہے کہ یہ شکل سے بڑی شریف پاک لڑکی لگتی ہے لیکن تجھے پتا ہی نہیں ہے کہ یہ کیا شے ہے۔ میں نے تو اس کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔"

"بہت کچھ سنا ہے' کیا مطلب؟"

جہانگیر نے ایک بار پھر دائیں بائیں دیکھا' پھر اشرف کی طرف جھکتے ہوئے آواز ذرا دھیمی کر لی۔ سرگوشی میں بولا "وہ اپنا یار طوطا ہے نا جو اسکول سے آکر موٹر مکینکی بھی کرتا

ہے؟"

"ہاں۔ ہاں۔ کیا کہتا ہے طوطا؟" اشرف نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"وہ کہتا ہے کہ اس ارمان کی ایک بڑی تحفہ فلم بھی آئی ہوئی ہے۔"

"تحفہ فلم۔ یہ کیا ہوتی ہے؟"

"اوئے پینڈو! تحفہ فلم کا نہیں پتا تجھے؟"

اشرف نے پھر ہونٹوں پر زبان پھیری اور معصومیت سے نفی میں سرہلایا۔ جہانگیر کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ ابھری جس میں برتری کا احساس تھا۔ وہ بولا۔ "اوئے کبھی تم نے انگریزی فلم دیکھی ہے وی سی آر پر؟"

اشرف نے کہا۔ "ایک بار تیرے ہی گھر دیکھی تھی تیرے بھائی جان کی شادی پر۔"

"تم نے دیکھا ہو گا کہ جب فلم چل رہی ہوتی ہے تو لڑکے لڑکی کے کچھ سین ایک دم آگے کر دیئے جاتے ہیں۔"

اشرف نے جلدی جلدی اثبات میں سرہلایا۔ "ہاں' میں نے کئی بار دیکھا ہے۔ کوئی "بڑا" فلم کو تیز چلا دیتا ہے یا ویسے ہی ٹی وی کو تھوڑی دیر کے لئے بند کر دیتا ہے۔"

"ہاں۔ بات تیری سمجھ میں آگئی ہے۔" جہانگیر نے دانا بینا لہجے میں کہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "دراصل "تحفہ" فلم ساری کی ساری ایسے ہی سین والی ہوتی ہے' بلکہ یہ تو اس سے بھی آگے کی شے ہوتی ہے۔"

ایک دم اشرف اور جہانگیر میں کھلبلی مچ گئی۔ دونوں بدک کر اپنی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ اشرف جلدی جلدی تراشے اور کاپیاں بستے میں گھسیڑنے لگا۔ سیڑھیوں پر آپا عارفہ کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔

"اوئے باگڑ بلو! یہاں کیا کر رہے ہو؟" عارفہ نے ان دونوں کے اُڑے اُڑے رنگ دیکھ کر کہا۔

"کچھ بھی نہیں آپا۔ مم........... میں تو جہانگیر کو اردو کی کتاب سے کہانی سنا رہا تھا۔"

آپا عارفہ کچھ دیر تک گھور گھور کر دونوں کو دیکھتی رہیں' پھر بولیں۔ "زیادہ کہانیوں کے چکر میں مت پڑا کرو۔ جاؤ اب نیچے' شام ہونے والی ہے۔"

دونوں کان لپیٹ کر نیچے اتر آئے۔

☆=========☆=========☆

اس دن کے بعد اشرف کو جب بھی موقع ملتا' جہانگیر کے ساتھ "تحفہ" فلم کے بارے میں اس کی بات ہوتی۔ جہانگیر کا کہنا تھا کہ وہ طوطے کے پیچھے پڑا ہوا ہے وہ ایک دو دن تک انہیں فلم لادے گا' جسے وہ گھر میں وی سی آر پر دیکھیں گے۔ دراصل جہانگیر کو اتوار کا انتظار بھی تھا۔ اتوار کے روز اس کے بھائی جان کو اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ ایک شادی پر جانا تھا۔ گھر میں صرف جہانگیر کی امی کو ہونا تھا۔ ان کی جہانگیر کو زیادہ پروا نہیں تھی۔

شدید انتظار کے بعد آخر ہفتے کا دن آن پہنچا۔ ہفتے کی شام کو جہانگیر ان کے گھر آیا اور اس نے گول گول آنکھیں گھما کر اشرف کو بتایا کہ فلم آگئی ہے۔ بس اب کل بھائی جان کے جانے کا انتظار ہے۔ ساری رات اشرف نے کروٹیں بدلتے ہی گزاری تھی۔ آخر وہ گھڑی آن پہنچی جس کا انہیں کئی دن سے انتظار تھا۔ اشرف' طوطے اور جہانگیر نے ایک کمرے میں گھس کر فلم دیکھی۔ وہ فلم شاید تین چار سال پرانی تھی۔ اس میں فلم ایکٹرس ارمان کافی کم عمر نظر آتی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ یہ فلم اس کی بے خبری میں بنائی گئی ہو' یہ بھی ہو سکتا تھا کہ صحیح فلم نہ ہو بلکہ ٹکڑے وغیرہ جوڑ کر کاریگری دکھائی گئی ہو' یہ بھی ممکن تھا کہ یہ سرے سے ارمان ہی نہ ہو بلکہ اس کی کوئی ہم شکل لڑکی ہو۔ اس کے علاوہ بھی کئی امکانات ہو سکتے تھے مگر امکانات پر غور کرنے کا ان لڑکوں کو ہوش ہی کہاں تھا۔

یہ ہوش ربا فلم دیکھ کر جب اشرف کمرے سے باہر نکلا تو وہ ساڑھے تیرہ سال کی عمر میں بالغ ہو چکا تھا۔ اس کی معصومیت جو ذرا ذرا سی بات پر اس کے رخساروں کو گل رنگ کر دیتی تھی' ایک دم ہی اس کے اندر سے نکل کر اڑن چھو ہو گئی تھی۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا اور آنکھوں میں چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ وہ گھر آکر لحاف میں پڑ رہا' اسے بخار سا چڑھ گیا تھا۔ اس کی امی اور آپا نے کئی بار اس سے پوچھا کہ کیا ہے لیکن وہ ٹال گیا۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ گھر والوں سے نظریں چرا رہا تھا۔

اگلے روز وہ گھر سے نکل کر سڑک پر آیا۔ اسَ نے جس لڑکی یا عورت کو دیکھا اسے یہی لگا کہ وہ ابھی کسی مرد کی طرف بڑھے گی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال دے گی' پھر اسی طرح کے مناظر شروع ہو جائیں گے جیسے اس نے فلم میں دیکھے تھے۔ اسے ہر طرف وہ فلم ہی فلم نظر آرہی تھی' یہاں تک کہ اپنے گھر میں اپنی امی اور آپا کی طرف بھی وہ نظر بھر کر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

دو تین راتیں اس نے عجیب بے قراری کے عالم میں گزاریں۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اندر سے بدل چکا ہے۔ کوئی تپش سی تھی جو ہر وقت اس کے نازک بدن میں جاگی رہتی تھی۔ خوب رو ارمان کا ناچتا تھرکتا بدن ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا۔ وہ اس تصور سے گھبرا کر آنکھیں بند کرتا تو تصور اور بھی اجاگر ہو جاتا۔ اس کی گوری سفید باہیں، اس کی پتلی کمر، اس کی صراحی دار گردن۔ اس کا حلق خشک ہونے لگتا پھر ایک دوبار ایسا بھی ہوا کہ ارمان کا تصور اس کے ذہن میں دھندلا کر کچھ فاصلے پر چلا گیا اور اس تصور کے پیچھے سے ایک اور شبیہ ابھر کر سامنے آگئی۔ یہ تارا کی شبیہ تھی۔ وہ تصور میں دیکھتا کہ وہ اس کے سامنے "پلے بندھنے" کی تشریح کر رہا ہے اور تارا کے نہایت ملائم اور چکنے گال شرم سے سرخ ہو رہے ہیں۔

ایک دن اشرف کے قدم جیسے خود بخود ماموں ارشاد کے گھر کی طرف اٹھ گئے۔ ماموں ارشاد کو یہاں لاہور میں بھی محکمہ انہار میں ملازمت مل گئی تھی۔ وہ صبح کے گئے شام سات بجے گھر آتے تھے۔ ان کی آمد تک گھر میں صرف تارا، اس کی والدہ یعنی ممانی بلقیس اور تارا کا چھوٹا بھائی اصغر ہی ہوتے تھے۔ اشرف گھر میں داخل ہوا تو تارا اپنی امی کے ساتھ مل کر کپڑے دھو رہی تھی۔ امی دھو رہی تھیں وہ انہیں نچوڑ نچوڑ کر الگنی پر پھیلا رہی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور تارا کے فارغ ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ پتا نہیں کیوں آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دیر تک ممانی کے گھر رہے۔ تارا کے پاس بیٹھے، اس سے باتیں کرے۔

اس کے دل میں ایک خیال آیا اور وہ خود ہی مسکرا دیا۔ گاؤں میں وہ اور تارا "گھر گھر" کھیلا کرتے تھے۔ کچھ اور بچے بھی اس کھیل میں ان کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔ وہ چھت پر چلے جاتے، چارپائیاں جوڑ کر ایک گھر سا بناتے۔ اس گھر میں اشرف اور تارا میاں بیوی کا کردار ادا کرتے۔ کوئی بچہ چاچو بن جاتا، کوئی امی اور کوئی نوکر۔ جھوٹ موٹ کی بھینسوں کا دودھ دھویا جاتا۔ خیالی چولہے میں تصوراتی آگ جلا کر جھوٹ موٹ کی روٹیاں پکائی جاتیں اور مزے سے کھائی جاتیں۔ نہ جانے کیوں آج اشرف کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دونوں پھر سے "گھر گھر" کھیلیں لیکن یہ تو تین چار سال پہلے کی باتیں تھیں، اب ان کی عمر گھر گھر کھیلنے کی نہیں رہی تھی۔

کچھ دیر بعد تارا فارغ ہو گئی۔ اسی دوران میں بڑے چاچو انعام اللہ کے بچے بھی

آگئے۔ انہیں ایک دوبار اشرف نے کہانی سنائی تھی اور وہ بڑے محظوظ ہوئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی اشرف نے کہا۔ "راجو۔ گڈو! آؤ تمہیں کہانی سناؤں۔"

بچے خوش ہو گئے لیکن تھوڑا سا حیران بھی ہوئے کہ اس سے پہلے تو فرمائش پر بھی نہیں سناتا تھا، آج بغیر فرمائش کے دن دیہاڑے سنانے پر آمادہ ہے۔ اشرف انہیں لے کر دوسری منزل پر واقع ایک کمرے میں آگیا۔ تارا بھی ساتھ ہی تھی۔ اشرف اگر ساڑھے تیرہ سال کا تھا تو تارا تیرہ کی ہو گی۔ گڈو بارہ سال کا تھا، راجو ابھی نرسری میں تھا۔

اشرف پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ تارا سمیت باقی تینوں اس کے ارد گرد پھیل گئے۔ اشرف انہیں کہانی سناتا رہا اور ساتھ ساتھ عام سے انداز میں تارا کے بالوں سے کھیلتا رہا۔ اس عمر میں ہی تارا کے بال نہایت گھنے اور لمبے تھے۔ تارا کی ساری توجہ اشرف کی کہانی کی طرف تھی اور اشرف کی ساری توجہ تارا کے بالوں کی طرف اور اس کے ہاتھوں کی طرف......... کہانی لڑکھڑا رہی تھی۔ کبھی کہیں پہنچ جاتی، کبھی کسی طرف نکل جاتی۔ سننے والے بار بار ٹوک رہے تھے۔ وہ کہانی کو پھر پٹڑی پر لاتا وہ پھر اتر جاتی۔ اسی اثنا میں اچانک نیچے سے چاچی کی آواز سنائی دی۔ وہ بچوں کو ڈانٹ رہی تھی کہ ان کے ٹیوشن کا وقت ہو گیا ہے، وہ جلدی سے نیچے آئیں۔

بچے بے مزہ ہو کر کہانی کو چھوڑ کر نیچے چلے گئے، بس تارا اس کے پاس بیٹھی رہ گئی۔

اشرف کا دل عجیب انداز سے دھڑکنے لگا۔ اس سے پہلے کبھی اس طرح نہیں دھڑکا تھا۔ وہ پہلے والی کہانی چھوڑ کر تارا کو ایک نئی انڈین فلم کی کہانی سنانے لگا۔ یہ فلم چار پانچ روز پہلے اس نے ایک چائے خانے پر صرف تین روپے دے کر دیکھی تھی۔ بڑی دھانسو قسم کی فلم تھی۔ دس بارہ گانے تھے۔ اس نے بڑی تفصیل سے فلم کے واقعات سنانے شروع کئے۔ بیچ بیچ میں اس نے تارا کو یہ بھی بتایا کہ یہ بڑی ہٹ فلم ہے۔ آخر تارا نے پوچھ ہی لیا۔ "یہ ہٹ فلم کیا ہوتی ہے؟"

"تم بھی نری پینڈو ہی ہو، ہٹ فلم اسے کہتے ہیں جو بہت زیادہ پسند کی جائے۔ دیکھنے والے اس پر ٹوٹ پڑیں۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ تو میں کیا بتا رہا تھا؟ ہاں جب ہیروئن مادھوری پتھروں پر چڑھتے ہوئے لڑکھڑانے لگی تو سنجے دت نے آگے بڑھ کر اسے اس کا بازو پکڑ لیا۔"

ٹھیک ایکشن بتاتے ہوئے اشرف نے باقاعدہ تارا کا بازو پکڑا' اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" تارا نے بازو چھڑاتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

"پھر وہ اوپر ڈاک بنگلے میں آگئے۔ وہی پتھروں کا بنا ہوا گھر۔ بارش میں دونوں بھیگ گئے تھے اس لئے انہوں نے آگ جلائی۔ وہ دونوں آگ کے قریب ایک دوسرے کے پاس پاس کھڑے ہو گئے۔ سمجھو کہ یہ آگ ہے اور یہ وہ دونوں کھڑے ہیں۔"

اشرف اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا' اس نے تارا کو بھی اپنے سامنے کھڑا ہونے کو کہا۔

گاہے گاہے وہ کھڑکی سے بھی جھانکتا تھا کہ باہر سے کوئی آ تو نہیں رہا۔ "سنجے دت سیدھا مادھوری کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس طرح مادھوری کے کندھوں پر رکھ دیئے۔" اشرف نے کہا اور ہاتھ تارا کے کندھوں پر رکھ دیئے پھر بولا۔

"اس کے بعد باہر بجلی کڑکی۔ گڑگڑ گڑ۔ اس کے ساتھ ہی سنجے نے کھینچ کر مادھوری کو گلے سے لگا لیا۔"

اس نے تارا کو گلے سے لگایا اور اپنا چہرہ اس کے قریب تر لے گیا۔ "چھوڑو! کیا کرتے ہو۔" تارا نے بیزاری سے کہا اور اشرف کو جھٹک کر پیچھے ہٹا دیا۔

تارا کے چہرے پر بیزاری اور جھنجلاہٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سی ناک چڑھا کر بولی۔ "پیچھے ہٹو۔ مجھے اس طرح کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔"

اشرف کے جسم پر ایک دم اوس سی پڑ گئی تھی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

"میں نے کیا کیا ہے۔ میں تو کہانی سنا رہا تھا۔"

"اچھا پیچھے ہٹو۔" اس نے اشرف کو سامنے سے ہٹایا اور نیچے چلی گئی۔

اشرف پتھر کی طرح ساکت اور بے حس اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

اگلے دو تین روز اشرف نے عجیب سی شرمندگی کے زیر سایہ گزارے۔ اسے رہ رہ کر تارا پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ وہ تو اس کی کوئی بات ٹالتی نہیں تھی' ہر وقت اس کے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھی۔ کوئی بھی مسئلہ ہوتا تھا اس کی رائے ہمیشہ اشرف کی رائے کے ساتھ ہی ملا کرتی تھی پھر اس نے اتنی بے رخی سے اشرف کو کیوں جھٹکا؟

وہ کئی دن تک ماموں کے گھر گیا اور نہ ہی اس نے تارا سے بات کی۔ ایک دو بار ممانی نے کسی کام سے بلایا بھی مگر وہ ٹال مٹول کر گیا۔ آخر ایک دن جب وہ چھت پر بیٹھا

پڑھ رہا تھا' تارا آ گئی۔ اس نے اشرف کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "اوئے! تم مجھ سے بولتے کیوں نہیں ہو؟"

"بس نہیں بولتا۔" اس نے رکھائی سے کہا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ "دیکھو! میں یہ تمہارے لئے کیا لائی ہوں۔" اس نے اشرف کی آنکھوں کے سامنے ایک دم مٹھی کھولی۔ اس میں اشرف کی پسندیدہ سونف سپاری کے پیکٹ تھے۔

اشرف نے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔

اس نے ایک پیکٹ کھولا اور لڑ جھگڑ کر زبردستی کچھ سونف سپاری اشرف کے منہ میں ٹھونس دی۔

اس دن دونوں میں صلح ہو گئی لیکن چند دن پہلے والی بات ابھی تک اشرف کے ذہن میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ جب بھی اپنی پسندیدہ ایکٹرا رمان کے بارے میں سوچتا تھا۔ تارا کا چہرہ بھی اس کی نگاہوں میں گھومنے لگتا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ جو کچھ سوچتا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اگر ماموں ممانی کو اس کا پتا چل گیا تو وہ بہت ناراض ہوں گے۔ خاص طور سے اپنے پیارے ماموں کی ناراضگی تو وہ کسی صورت مول نہیں لے سکتا تھا لیکن دوسری طرف اس کی افتاد طبع تھی اور اس کا فطری تجسّس تھا جو اسے ہر گھڑی بے چین رکھتا تھا۔ ٹی وی کے ڈرامے' فلمیں اور اخبارات کے رنگ برنگے اشتہارات اس کی بے کلی میں اضافہ کرتے تھے۔ وہ جہاں کہیں ارمان کا چہرہ دیکھ لیتا تھا بس دیکھتا چلا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے اندر کی محرومی اور نارسائی اپنے عروج پر پہنچ جاتی تھی۔

ایک دن وہ پھر ماموں ارشاد کے گھر جا پہنچا۔ سہ پہر کا وقت تھا' ممانی سو رہی تھیں۔ نوکر سبزی کاٹ رہا تھا۔ اتفاقاً گھر میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ تارا اوپر کے کمرے میں بیٹھی اسکول کا کام کر رہی تھی۔ اشرف اس کے پاس ہی جا بیٹھا۔ قریب ہی اخبار کے رنگین فلمی صفحات پڑے تھے۔ فلمی پریوں کی ہوش ربا تصویریں تھیں' لیکن ان میں ارمان کی تصویر کہیں نہیں تھی اس لئے اشرف نے اسے ایک طرف ڈال دیا۔ وہ خبروں والا اخبار پڑھنے لگا۔ بیچ بیچ میں سے وہ تارا کو بھی سنا رہا تھا۔ "یہ "زیادتی" کیا ہوتی ہے؟" تارا نے معصومیت سے پوچھا۔

"سائیڈ ہیرو جب ہیروئن کو تنگ کرتا ہے تو اسے زیادتی کہتے ہیں۔" اشرف نے بتایا۔

"اور مجرمانہ حملہ؟" تارا نے پوچھا۔

"اس کے بارے میں تو مجھے بھی پتا نہیں۔ جہانگیر سے پوچھوں گا۔ اسے پتا ہو گا' نہیں تو جہانگیر کے یار طوطے کو ضرور پتا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ بھی زیادتی سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے۔"

"اچھا کوئی دوسری خبر پڑھو۔" تارا نے بیزاری سے کہا۔

اشرف دوسری خبریں پڑھنے لگا۔ ساتھ ساتھ غیر محسوس طور پر اس کا ایک ہاتھ تارا کے بالوں سے الجھ رہا تھا۔ وہ ظاہر یہی کر رہا تھا جیسے بے خیالی میں ایسا کر رہا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ تارا برا نہیں مانے گی' کیونکہ دو تین دن پہلے ہی اس نے بڑی مشکل سے اشرف کو منایا تھا۔ اب اشرف کے سامنے فلمی اشتہارات کا صفحہ تھا۔ کئی جگہ ہیرو ہیروئن بغل گیر نظر آرہے تھے۔

ان کے درمیان مارکر سے سیاہ لائن کھینچ دی گئی تھی' مگر دیکھنے والے کے ذہن پر ایسی لائن نہیں کھینچی جا سکتی۔ "یہ دیکھو! جاوید شیخ نے سلمیٰ آغا کو کس طرح گلے سے لگا رکھا ہے۔"

"ہوں۔" تارا نے بیزار لہجے میں ہنکارا بھرا۔

"یہ نیا اسٹائل ہے۔ پہلی فلموں میں پتا ہے کیسے گلے لگاتے تھے؟"

"کیسے؟" اس نے بے دھیانی سے کہا۔

"ایسے۔" اشرف نے بیٹھے بیٹھے تارا کو بانہوں میں لینے کی کوشش کی۔

"اشرفی! کیا کرتے ہو؟ پیچھے ہٹو۔" وہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔

یہی وقت تھا جب اچانک ممانی دروازے پر نمودار ہوئیں۔ ان کی آنکھوں میں حیرت آمیز غضب کی چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔

اشرف ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گیا۔ تارا بھی خوف زدہ نظر آنے لگی۔ آتے ساتھ ہی ممانی نے ایک زور کا تھپڑ اشرف کے منہ پر مارا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے۔ بایاں کان شائیں شائیں کرنے لگا تھا۔ ممانی نے بالوں سے پکڑ کر اشرف کو جھنجوڑا اور غراتی آواز میں بولیں۔ "دفع ہو جا یہاں سے۔ نکل جا میرے گھر سے۔

بد معاش کہیں کا' عمر دیکھو اور کام دیکھو۔"

اشرف کے پاؤں میں صرف ایک جوتی تھی' دوسری ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ ایسے ہی دروازے کی طرف بڑھا۔ ممانی نے ایک اور دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑایا اور گرتے گرتے بچا۔ وہ اتنی تیزی سے سیڑھیاں اترا کہ اسے پتا ہی نہیں چلا' کب نیچے پہنچ گیا۔ اس کا بایاں گال ابھی تک سنسنا رہا تھا۔

☆=========☆=========☆

ساری رات اس کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزتا رہا۔ گاہے گاہے آنکھوں سے گرم آنسو بہنے لگتے تھے۔ وہ خود کو کوس رہا تھا' اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس سے ایسا کیوں ہوا؟ جب وہ جانتا تھا کہ یہ باتیں ٹھیک نہیں تو پھر وہ کیوں باز نہ رہ سکا؟ اس کے ساتھ ہی پیش آمدہ اندیشے اسے گھیر لیتے تھے۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اب کیا ہونے والا ہے؟ کیا ممانی یہ بات ماموں تک پہنچائیں گی؟ ماموں کیا کریں گے؟ کیا یہ بات امی جان اور عارفہ تک پہنچے گی؟ اگر پہنچے گی تو پھر اس کا حشر کیا ہو گا؟

وہ روتا رہا اور رو رو کر خدا سے معافی مانگتا رہا۔ "اے میرے مالک! اس مرتبہ۔ صرف اس مرتبہ مجھے معافی دلا دے۔ آئندہ مر کر بھی کوئی ایسا کام نہیں کروں گا۔ کوئی فلم نہیں دیکھوں گا' کوئی ڈراما نہیں دیکھوں گا۔ جہانگیر اور طوطے کی دوستی بھی چھوڑ دوں گا۔ وہی سب کچھ کروں گا جو ابا جان کہا کرتے ہیں۔"

جاگتے جاگتے جب اسے اونگھ سی آتی تو خیال میں ایک بار پھر ممانی کی غضب ناک آنکھیں آجاتیں۔ وہ گڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔

صبح اس نے ڈرتے ڈرتے سب کے چہرے دیکھے۔ چہرے نارمل ہی تھے۔ صحن میں وہ ایک جوتی بھی پڑی تھی جو ممانی کے گھر سے بھاگتے ہوئے وہاں رہ گئی تھی۔ اسے تھوڑا سا حوصلہ ہوا۔ دو دن اسی طرح گزر گئے۔ تیسرے دن ماموں ارشاد اس کے گھر آئے اور اسے اپنے ساتھ قریب ہی واقع چلڈرن پارک میں لے گئے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار اشرف کو وہاں ہوا خوری کے لئے لے جاتے تھے۔ بچپن سے ہی ماموں کو اشرف سے بڑا پیار تھا۔

چلڈرن پارک میں جا کر ماموں نے بڑے دھیمے لہجے میں اشرف کو سمجھانا شروع کیا۔ ان کی طویل گفتگو کا آغاز اس فقرے سے ہوا۔ "اشرفی! تم بڑے اچھے لڑکے ہو۔" باقی کی

گفتگو میں انہوں نے اشرف کو وہ سب کچھ سمجھایا جو ہمدرد بزرگ کی حیثیت سے انہیں سمجھانا چاہئے تھا۔ انہوں نے اشرف سے کہا کہ وہ سویرے اٹھا کرے۔ نماز باقاعدگی سے پڑھے۔ پڑھائی میں دلچسپی لے اور بیکار قسم کے لڑکوں کی دوستی چھوڑ دے۔ اشرف بس بیمار بکرے کی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا اور اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ ندامت کے بوجھ سے اس کی پلکیں نہیں اٹھ رہی تھیں۔

اس روز ماموں کے سمجھانے کے بعد، دو تین ہفتے تو ٹھیک گزرے، اس کے بعد دھیرے دھیرے پھر وہی پرانی مصروفیات اشرف کی زندگی میں داخل ہونے لگیں۔ ارمان کی فلمیں تو ایک نشے کی طرح تھیں جن سے وہ کسی طور چھٹکارا پا ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ فلمیں اور دیگر واہیاتیات ایک نادیدہ جال کی طرح اس کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔ وہ ان سے کہاں تک بچتا، اور پھر جہانگیر، طوطے جیسے دوست تھے جو اسکول اور گھر، غرض ہر جگہ اس کی زندگی میں مداخلت کر رہے تھے۔

جہانگیر چند ہفتے کے وقفے کے بعد اب پھر اشرف کے گھر آنے جانے لگا تھا۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ اس کی نئی نویلی بھابی نشاط بھی ہوتی تھیں۔ نشاط کی دوستی اشرف کی آپا عارفہ سے ہو گئی تھی۔ دونوں دیر تک باتیں کرتی رہتیں، اس دوران میں اشرف اور جہانگیر دوسری منزل کے برآمدے میں ٹینس بال پر ٹیپ چڑھا کر کرکٹ کھیلتے یا باتیں کرتے۔ ایک دو بار آپا عارفہ اور جہانگیر کی بھابی نشاط بھی کھیل میں شریک ہوئیں۔ نشاط بھرے بھرے جسم کی خوب صورت لڑکی تھی۔ اوپر سے نئی نئی شادی ہوئی تھی، وہ لباس بھی بڑے شوخ اور طرح دار پہنتی تھی۔ اشرف اسے چلتے پھرتے اور تیزی سے سیڑھیاں اترتے دیکھتا تو اسے اپنے سینے میں سرسراہٹ سی محسوس ہوتی۔

جہانگیر کی بھابی نشاط کو ہاتھ دکھانے اور دیکھنے میں بھی دلچسپی تھی۔ ایک دن وہ اوپری منزل کے برآمدے میں بیٹھی آپا عارفہ کا ہاتھ دیکھ رہی تھی، اشرف قریب سے گزرا تو آپا نے آواز دے کر اسے بلا لیا۔ "ادھر آ لنڈورے! باجی کو ہاتھ دکھا۔ پتا چلے کہ تیری قسمت میں بھی کچھ پڑھائی لکھائی ہے یا نہیں۔"

اشرف نے انکار کیا تو آپا اسے کان سے کھینچ کر نشاط کے پاس لے گئیں۔ "چل بیٹھ ادھر۔" انہوں نے تحکم سے کہا۔

"ہائے ہائے چھوڑ اس کا کان! کوئی بچہ تو نہیں ہے۔" نشاط نے مداخلت کرتے ہوئے

آپا سے اس کا کان چھڑایا۔

اشرف کا ہاتھ نشاط کے ہاتھ میں آیا تو اشرف کے جسم میں برق سی دوڑ گئی۔ نرم ملائم ہتھیلی۔ گداز اور حرارت کا دل نشیں امتزاج۔ کلائی میں ہفت رنگ چوڑیاں۔ گلابی زمین اور سفید پھولوں والا ویلوٹ کا چمکتا سوٹ۔ ایک مدھر خوشبو اشرف کے نتھنوں سے ٹکرائی اور پورے جسم میں بکھر گئی۔ نشاط اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی اس کی ہتھیلی پر پھیرتی رہی اور لکیروں کا حساب کتاب بتاتی رہی۔ "یہ دل کی لکیر ہے، یہ علم کی، یہ عمر کی۔ یہ روپے کی۔"

اس کی حنائی انگلی اشرف کی ہتھیلی پر میٹھی میٹھی گدگدی کر رہی تھی۔ وہ بولی۔ "اشرف، تمہاری شادی کی لکیر بڑی ٹیڑھی ہے۔ خیر چھوڑو۔ یہ دیکھو یہ زحل کے ابھار.......... کے نیچے جو چھوٹی چھوٹی لائنیں ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم اپنی بیوی کو شدید محبت دینے کی خواہش رکھو گے اس کے علاوہ تمہارے اندر جستجو بہت ہے۔ تم چیزوں کو کھوجنا چاہتے ہو۔ ان کی تہہ تک پہنچنے کی فوری خواہش تمہارے اندر بڑی تیزی سے جاگتی ہے۔"

اشرف نے دل ہی دل میں کہا۔ "تم کہتی تو ٹھیک ہو۔ واقعی ہر نئی چیز کو کھوجنا چاہتا ہوں، جیسے تم ہو۔ تمہارے اندر جھانکنے کا خواہش مند ہوں، لیکن تم مجھ سے بہت دور ہو اور یہ دوری مجھے اور الجھاتی ہے۔"

نشاط کہہ رہی تھی۔ "اگر ایسے لوگ اپنے تجسّس کو علم حاصل کرنے میں استعمال کریں تو بڑی جلدی بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ تم خوب دل لگا کر پڑھو۔ تمہارے جیسے لوگ ہی نیوٹن، آرشمیدس اور البیرونی بنتے ہیں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔"

نشاط کے جسم سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو اشرف کو مسحور کئے دے رہی تھی۔ اس کی چوڑیوں کی کھنک ایک رس بھرے نغمے کی طرح تھی۔

اس دن کے بعد نشاط کے ساتھ اشرف کی اکثر گپ شپ رہنے لگی۔ پامسٹری وغیرہ سے اشرف کو بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی مگر اسے نشاط میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی للذا اس نے ہاتھ کی لکیروں کو اہمیت دینا شروع کر دی۔ کبھی نشاط سے اس کا سامنا ہوتا تو وہ ان لکیروں کو لے کر بیٹھ جاتا۔ "یہ دیکھو باجی! یہ انگوٹھے کے ساتھ آپ نے بتایا تھا کہ زندگی

کا خط ہے‘ اس کے ساتھ ہی یہ دوسری لائن کون سی ہے؟“

”اسے خط مریخ کہتے ہیں۔“

”مگر میرے ہاتھ میں یہ خط درمیان سے ٹوٹا ہوا ہے۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ باجی اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہتی۔

اشرف کا اصل مقصد نشاط کو اپنا ہاتھ تھمانا ہی ہوتا تھا۔ جب وہ ہاتھ تھام لیتی اور اس کی حنائی انگلی کی پور اشرف کی ہتھیلی پر گدگدی شروع کر دیتی تو وہ بات کو طول دینے کی کوشش کرتا۔ ”یہ دیکھیں۔ اس لائن کے بارے میں آپ نے بتایا تھا کہ یہ دل کی ہے اور اگر یہ زحل کے ابھار کے نیچے دماغ کی لکیر کو چھو رہی ہو تو یہ عجیب و غریب قسم کی سوچوں کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ دیکھیں یہاں یہ لکیر دماغ کی لکیر کو چھو رہی ہے۔“

”بھئی چھو نہیں رہی‘ یہ دیکھو یہاں خط وجدان سے آگے یہ ٹوٹی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔“

اس قسم کی باتوں سے اشرف کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا تھا‘ وہ زیادہ سے زیادہ دیر نشاط کے پاس بیٹھے اور اس کا ہاتھ نشاط کے ہاتھ میں رہے۔ تارا کے حوالے سے اسے جو صدمہ پہنچا تھا شاید اسی کے ازالے کے لئے وہ خوب رو نشاط کے خیالوں میں پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ گاہے گاہے اسے تارا کا خیال بھی شدت سے آتا تھا اور اس کے ساتھ ہی ممانی کی آتش بار سرخ آنکھیں اس کے تصور میں چمک جاتی تھیں۔ ایسے میں اس کا بایاں گال ایک طمانچے کے ذائقے کو محسوس کرتا تھا اور اس کا دل ڈوب سا جاتا تھا۔ اس نے ایک دو دفعہ تارا کو دیکھا تھا‘ وہ اس سے دور دور رہتی تھی اور بات بھی کم کرتی تھی۔ یقیناً ایسا ممانی کی ہدایت پر ہی تھا۔ گھر میں آ کر ایک قاری صاحب تارا کو سپارہ پڑھانے لگے تھے اور اوڑھنی مضبوطی سے اس کے سر اور کانوں کو ڈھانپے رہتی تھی۔

ایک دن نشاط نے اشرف کی آپا سے کہا۔ ”عارفہ! اشرف پر بس تھوڑی سی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ یہ پڑھائی میں ایک دم ٹھیک ہو سکتا ہے۔ امتحانوں میں ابھی تین چار مہینے ہیں‘ یہ تھوڑی سی محنت کر لے تو بڑے اچھے نمبروں سے پاس ہو سکتا ہے۔“

عارفہ نے کہا۔ ”بات تو ٹھیک ہے‘ مگر یہ کہیں ٹک کر بیٹھے تب ہے نا۔“

”تم ایسا کرو شام چار بجے کے بعد اسے میرے پاس بھیج دیا کرو۔ میں اسے ایک دم سیدھا کر دوں گی۔“

عارفہ کو اکثر اشرف کی فکر ستاتی رہتی تھی۔ وہ خود بھی بی ایس سی کی تیاری کر رہی تھی۔ لہٰذا اسے وقت نہیں دے سکتی تھی۔ اس نے فوراً نشاط کی آفر قبول کر لی۔ اشرف چار بجے کے بعد جہانگیر کی بھابی نشاط سے پڑھنے جانے لگا۔ وہ واقعی بڑی دلچسپی اور محبت سے پڑھاتی تھی۔ ایک ایک لفظ اشرف کے ذہن میں اتر جاتا تھا۔ اگر اس کی توجہ صرف پڑھائی پر ہوتی تو شاید وہ اسکول میں پہلی پوزیشن حاصل کرتا لیکن اس کی زیادہ توجہ پڑھانے والی پر تھی۔ نشاط کا قرب اسے مدہوش سا کر دیتا۔ اس کے بدن پر خفیف لرزش طاری ہو جاتی اور حلق خشک ہونے لگتا۔ نشاط اسے بڑی ملائمت اور محبت سے اشرفی کہہ کر بلاتی تھی۔ وہ اس کے لہجے کو نئے نئے معنی پہناتا اور کسی وقت اسے شک ہوتا تھا کہ شاید نشاط اس ساری ہلچل سے واقف ہے جو نشاط کے قریب ہوتے ہوئے اس کے دل میں مچی رہتی ہے۔ ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ نشاط نے اشرف کو چور نظروں سے اپنی طرف دیکھتے پایا اور مصنوعی غصے سے کہا۔ ”اشرفی! اپنی کتاب کی طرف دھیان رکھو۔“

نشاط کا دیور اور اشرف کا دوست جہانگیر ان دنوں اپنی دادی ماں کے پاس کراچی گیا ہوا تھا۔ اس کی دادی بیمار تھیں اور انہوں نے جہانگیر کو بلوایا تھا اشرف اکثر سوچتا تھا کہ اگر جہانگیر بھی یہاں موجود ہوتا تو شاید اسے اتنی اتنی دیر نشاط کے پاس تنہا بیٹھنے کا موقع نہ ملتا۔

انہی دنوں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے اشرف کے دل میں مچی ہوئی ہلچل کو شدت دے دی۔ اشرف نشاط کے گھر میں پڑھ رہا تھا۔ اس کا آٹھویں کا امتحان اب بس ڈیڑھ دو ماہ کی دوری پر تھا۔ اکثر وہ آٹھ نو بجے تک نشاط کے گھر ہی رہتا تھا۔ نشاط کو اپنے خاوند یعنی جہانگیر کے بھائی جان کے ساتھ کہیں باہر جانا تھا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہو رہی تھی۔ جلدی میں اس کے بالوں کا کلپ کچھ اس طرح بالوں میں الجھا کہ بس پھنس کر رہ گیا۔ نشاط نے چھوٹی ملازمہ بچی کو مدد کے لئے پکارا‘ اس نے بھی کوشش کی مگر کلپ نہیں نکلا۔ اشرف نے دیکھا تو اٹھ کر نشاط کی مدد کو پہنچ گیا۔ دندانے دار کلپ کو نکالنا واقعی مشکل ثابت ہوا اس دوران میں اشرف کے ہاتھ نشاط کے ریشمی سیاہ بالوں میں ڈوبتے ابھرتے رہے۔ نشاط کے ہونٹوں سے بار بار سسکاری نکل جاتی تھی! ”اشرفی! دھیان سے‘ اف......... ہائے۔“

نشاط کو تکلیف سے بچانے کے لئے اشرف نے بالوں کے نچلے حصے کو اس طرح تھاما کہ کلپ نکالنے کے لئے جن جھٹکوں کی ضرورت تھی ان کا اثر بالوں کی جڑوں تک نہ

پہنچے۔ یوں دو تین منٹ کی کوشش سے اس نے کلپ باہر کھینچ لیا۔ نشاط سٹپٹائی ہوئی تھی‘ اسے پہلے ہی دیر ہو رہی تھی‘ اب اور دیر ہو گئی تھی۔ جلدی میں اکثر کام الٹے ہوتے ہیں۔ نشاط کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ جب اس کے شوہر صاحب نے نیچے گلی میں آ کر موٹر سائیکل کا ہارن بجانا شروع کیا‘ وہ اندر کمرے میں کپڑے بدل رہی تھی۔ وہ اندر ہی سے آواز دے کر بولی۔ ”اشرفی! اپنے بھائی جان سے کہو۔ بس دو منٹ رکو میں آ رہی ہوں۔“

اشرف نے دوسری منزل کی کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ گلی میں بھائی جان اسٹارٹ موٹر سائیکل پر بیٹھے ہوئے تھے اور جھلائے ہوئے تھے۔ اشرف نے کہا۔ ”بھائی جان! وہ کہہ رہی ہیں‘ صرف دو منٹ ٹھہریں۔ میں تیار ہوں بس نکل رہی ہوں۔“

اشرف واپس کمرے میں آیا تو نشاط ساٹن کا خوب صورت آسمانی سوٹ پہن کر بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھ چکی تھی۔ پورا کمرا اس پرفیوم کی خوشبو سے مہک رہا تھا جو اس نے لگایا تھا۔ اشرف اس کے قیامت بدن کو چور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنی مگن تھی کہ اس کی چوری پکڑ نہیں سکتی تھی۔ جلدی سے لپ اسٹک لگا کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ پشت کی طرف موڑے۔ جیسے کمر کھجانے کی کوشش کی جاتی ہے مگر وہ کمر نہیں کھجا رہی تھی‘ کچھ اور کر رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ جھلا کر کرسی پر بیٹھ گئی اور ذرا سا آگے کو جھک گئی۔ ”اشرفی! یہ میری قمیض کی زپ بند کرو ذرا۔“

اشرف کا دل جیسے ایک دم ہی حلق میں دھڑکنے لگا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ ریشمی بالوں کے جُوڑے کے نیچے نشاط کی ریشمی جلد اس کے سامنے تھی۔ جلدی میں کلپ کی طرح زپ بھی الجھ گئی تھی۔ اسے سلجھانے کی ضرورت تھی‘ اشرف تو خود الجھا ہوا تھا اسے کیا سلجھاتا۔ کانپتے ہاتھوں سے وہ پتا نہیں کس طرح زپ بند کرنے میں کامیاب ہوا۔ نشاط جلدی سے چادر لیتی ہوئی اور ہینڈ بیگ سنبھالتی ہوئی نیچے چلی گئی۔ اشرف وہیں پتھر کا بت بنا کھڑا رہا۔ اس کی انگلیوں کی پوریں جیسے ابھی تک کسی گداز ریشم میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

اس سے اگلے روز اس نے اپنے ایک دوست کے گھر وڈیو پر ارمان کی ایک نئی فلم دیکھی۔ اس فلم میں ارمان نے بڑے ہوش ربا رقص کئے تھے۔ کئی لوگ تو صرف ارمان کے ڈانس کے لئے یہ فلم دیکھ رہے تھے۔ جو کام اکثر فلموں میں بارش اور پانی سے لیا جاتا ہے وہ اس فلم میں تیز ہوا سے لیا گیا تھا۔ ایک مہین باریک سی ساڑی پہنے ارمان نے تند و تیز ہوا میں ایک بدمست گانا گایا تھا۔ اس گانے کو دیکھ دیکھ کر ناظرین لوٹ پوٹ ہو رہے

تھے۔ اشرف نے بھی اس گانے کو اضافی دلچسپی سے دیکھا۔ جب وہ یہ گانا دیکھ رہا تھا نہ جانے کیوں ارمان کے تھرکتے مچلتے جسم پر سے اس کا چہرہ او جھل ہو گیا اور وہاں نشاط کا چہرہ جگ گیا۔ اس نے ٹی وی اسکرین پر ارمان کے بجائے نشاط کو توبہ شکن انگڑائیاں لیتے دیکھا۔ اس کی انگلیوں کی پوروں میں ایک ریشمی لمس کی پیاس جاگنے لگی۔

آنے والے چند دنوں میں نشاط اس بری طرح اشرف کے ذہن پر سوار ہوئی کہ ہر طرف بس وہی وہ نظر آنے لگی۔ نشاط کے شوہر یعنی جہانگیر کے بھائی جان اپنے دفتری کام کے سلسلے میں پورے ایک مہینے کے لئے مانسہرہ چلے گئے تھے۔ نشاط کے پاس اشرف کو پڑھانے کے لئے اب زیادہ ٹائم ہوتا تھا اور وہ امتحانات کے پیش نظر اس پر توجہ بھی زیادہ دے رہی تھی لیکن اشرف کے ذہن میں تو کوئی چیز تب گھستی جب وہاں کوئی جگہ ہوتی‘ ادھر تو اور بہت کچھ بھرا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں اشرف کا دل گواہی دیتا تھا کہ نشاط‘ اس کے دل میں ہونے والی کھد بد سے آگاہ ہے۔ کچھ ہی دن پہلے اس نے ایک پاکستانی فلم دیکھی تھی۔ اس میں اشرف ہی کی عمر کا ایک لڑکا اپنے سے کئی سال بڑی حسینہ سے پیار کرتا ہے۔ یہ ان دونوں کے پیار ہی کی کہانی تھی۔ یہ فلم دیکھنے کے بعد اشرف کو اس امر کا یقین ہو گیا تھا کہ مرد عورت میں اس قسم کا معاملہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ فلم اشرف نے طوطے کے ساتھ دیکھی تھی۔ یہ فلم دیکھنے کے بعد منٹو پارک میں گھومتے ہوئے طوطے نے اشرف کو ایک دو مزید ایسے واقعات بتائے تھے جن سے اشرف کو پتا چلا تھا کہ پیار میں دولت اور شکل و صورت کی طرح عمر کا فرق بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

چند دن بعد اشرف کو اپنے گھر والوں کے ساتھ ایک شادی میں اپنے آبائی گاؤں ”رنگی“ جانا تھا۔ وہاں ان کا پانچ چھ دن رہنا ضروری تھا۔ شروع میں تو امی اور آپا کا خیال تھا کہ اشرف کو لے جایا ہی نہ جائے کیونکہ اس کے امتحان قریب آ رہے تھے مگر پھر آخری فیصلہ اشرف کو ساتھ لے جانے کے حق میں ہوا تھا۔ آپا نے کہا تھا کہ اشرف کتابیں ساتھ لے جائے گا اور وہاں پڑھتا رہے گا۔ اشرف کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنے دن نشاط سے دور رہ کر کیسے گزارے گا۔ نشاط کو دیکھنا جیسے اس کی ضرورت بن چکا تھا۔ اب وہ کسی وقت تارا کے بارے میں سوچتا تھا تو وہ اسے کوئی دور کی چیز نظر آتی تھی اور اس کے بارے میں اپنی حماقتیں یاد کر کے وہ شرمندہ سا ہو جاتا تھا۔ ایک روز وہ نشاط کے گھر پہنچا تو وہ اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر پڑھنے لگا۔ گاہے

گاہے اس کی نظر نشاط کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ چھوٹی ملازمہ لڑکی "ننھی" گھر میں موجود نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد جہانگیر کی والدہ بھی کسی کام سے باہر چلی گئیں۔ نشاط بدستور گہری نیند سو رہی تھی۔ اسے دیکھ دیکھ کر اشرف کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ وہ اٹھ کر بلی کی چال چلتا کمرے میں آگیا۔ وہ اس کے بے ترتیب جسم کو دیکھتا رہا۔ اس کے بالوں کی چند لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں جیسے چاند کے چہرے پر بادل کی لہریں سی آگئی ہوں۔ اس کی اوڑھنی پلنگ سے نیچے لٹک رہی تھی۔ اس نے اوڑھنی آہستہ سے واپس پلنگ پر رکھ دی۔ اس کی بوجھل سانسوں کی آواز اشرف کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اشرف بالکل قریب سے اسے دیکھنے لگا پھر نہ جانے کیسے اس کے ہاتھ نے اچانک حرکت کی اور بڑی آہستگی سے نشاط کے رخسار پر آگیا۔ اس کی انگلیوں کی جلتی ہوئی پوریں بڑی ملائمت سے نشاط کے ریشمی ملائم رخسار پر حرکت کرنے لگیں۔ وہ اس دلگداز لمس کو اپنی انگلیوں کے راستے اپنے دل میں اتارنے لگا پھر اس نے دوسرے رخسار کو چھوا۔ اس کی نرمی اور گرمی کو پوری وضاحت کے ساتھ محسوس کیا۔ یہ ایک حد تھی۔ وہ اس سے آگے قدم نہیں اٹھا سکتا تھا کیونکہ وہ جاگ جاتی۔

دل اس کے سینے میں ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ وہ اسے سنبھالتا ہوا واپس برآمدے میں اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ اس رات اپنے گھر جا کر اس کے دل میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ اس نے لاہور آکر کسی سے سنا تھا کہ عشق محبت کے معاملوں میں پہل اکثر مرد کو ہی کرنی پڑتی ہے ورنہ یہ معاملے ادھورے رہ جاتے ہیں۔ نشاط کے ساتھ اپنے "معاملے" کو ادھورے پن سے بچانے کے لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے خط لکھے گا۔ ایسا خط جس میں پوری سچائی اور دلیری کے ساتھ اپنے دل کا سارا حال نشاط سے کہہ ڈالے گا۔ بالکل جیسے دور درشن کے ڈرامے پہلی محبت میں نوعمر ہیرو نے اپنی محبوبہ سے کہا تھا۔

اس نے رات کو بیٹھ کر ایک خط لکھا۔ "نشاط صاحبہ۔ سچ، سچ ہوتا ہے اور جھوٹ جھوٹ.......... میں جانتا ہوں کہ میں آپ سے چھوٹا ہوں اور جو کچھ میں لکھ رہا ہوں، یہ مجھے نہیں لکھنا چاہئے لیکن سیانے سچ کہتے ہیں، دل پر کسی کا زور نہیں ہوتا۔ میں بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا ہوں۔ میں آپ سے پیار کرتا ہوں، اتنا زیادہ پیار کہ شاید آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ میری زندگی میں آپ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ آپ مجھے پڑھانا

چاہتی ہیں مگر میرا دل پڑھائی میں بالکل بھی نہیں لگتا۔ میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ کاش آپ کی شادی نہ ہوئی ہوتی۔ میں آپ کو دلہن بنا کر اپنے گھر لے جاتا۔" اس سے آگے اشرف نے ڈش پر دیکھے ہوئے ٹی وی ڈرامے "پہلی محبت" کے ہی دو ڈائیلاگ لکھ دیئے تھے۔

اس نے لکھا تھا۔ "نشاط! محبت صرف محبت ہوتی ہے۔ اس کا کوئی ملک ہوتا ہے نہ مذہب اور نہ عمر۔ اکثر یہ وہیں پر ہوتی ہے جہاں نہیں ہونی چاہئے۔"

ان آخری دو جملوں کی پوری سمجھ تو اسے نہیں آئی تھی مگر یہ جملے اسے اچھے لگے تھے چونکہ یہ جہانگیر اور طوطے کو بھی اچھے لگے تھے اس لئے اشرف نے یہ خط میں لکھ ڈالے۔ لکھنے کے بعد اس نے خط کو پڑھا تو لفظ اور فقرے ذرا بھاری بھاری لگے، مگر اس نے سوچا جو لکھ دیا سو لکھ دیا۔ نشاط نے کون سا اس کے سامنے یہ خط پڑھنا تھا۔ بلکہ اشرف کی تو پلاننگ ہی اور تھی۔ اس نے یہ خط نشاط کو کل سہ پہر دینا تھا۔ اس کے فوراً بعد ان لوگوں کو گاؤں جانے کے لئے ریلوے اسٹیشن روانہ ہو جانا تھا۔ وہاں سے اشرف کی واپسی پانچ چھ روز بعد ہی ہونا تھی۔ لہٰذا امکان نہیں تھا کہ خط دینے کے فوراً بعد اشرف کو کسی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت وہ نشاط کے گھر گیا۔ نشاط یہی سمجھی کہ وہ اسے گاؤں جانے سے پہلے خدا حافظ کہنے آیا ہے۔ وہ باورچی خانے میں کام کر رہی تھی۔ چاول لینے کے لئے ایک منٹ کے لئے اسٹور روم میں گئی تو اشرف نے دھڑکتے دل کے ساتھ خط اس پرات میں رکھ دیا جس میں ماش اور چنے کی دال تھی۔ نشاط یہ دال چنتے چنتے اسٹور میں گئی تھی۔ خط رکھ کر اشرف تیزی سے سیڑھیاں اترا اور واپس اپنے گھر آگیا۔ امی جان ابا جان آپا اور دیگر افراد سامان باندھے بالکل تیار بیٹھے تھے، فقط اشرف کا انتظار تھا۔ سامان ٹیکسی میں رکھا جا چکا تھا۔ جونہی اشرف آیا سب لوگ ٹیکسی میں بیٹھ گئے.......... مگر ٹیکسی نے چلنے سے انکار کر دیا، کیونکہ اس کا پہیا پنکچر ہو چکا تھا۔

اب پہیا بدلنے میں آٹھ دس منٹ تو لگ ہی جانے تھے۔ ابا جان گھر کے اندر چلے گئے اور اخبار پڑھنے لگے، اشرف بے قراری سے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اچانک اس کی رگوں میں خون جم کر رہ گیا۔ اس نے دیکھا کہ نشاط چادر لئے تیز قدموں سے اسی کی طرف چلی آرہی ہے۔ اس کے آنے کا انداز "حوصلہ افزا" ہرگز نہیں تھا۔ ایک لمحے کے

لئے تو اشرف کے دل میں آئی کہ کھسک جائے مگر گھر والے ارد گرد موجود تھے۔

اشرف کے قریب پہنچ کر نشاط نے کہا۔ "اشرفی! میرے ساتھ آؤ' میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

اس کا لہجہ نارمل ہی تھا اشرف کچھ اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ غصے میں ہے یا نہیں۔

اشرف نے ہکلا کر کہا۔ "ہم جا رہے تھے.........."

"کوئی بات نہیں' ابھی گاڑی چلنے میں ڈیڑھ دو گھنٹے پڑے ہیں۔"

امی نے بھی کہا۔ "جاؤ سن آؤ بات۔"

اشرف مرے مرے انداز میں نشاط کے ساتھ چلتا ہوا ان کے گھر پہنچا۔ نشاط اسے لے کر ایک کمرے میں گھس گئی۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا اور چادر اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی اور رنگ زرد ہو رہا تھا۔

"اشرفی! یہ خط تم نے لکھا ہے؟" اس نے خط اشرف کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

اس کے تاثرات نے اشرف کو ڈرا دیا۔ اس نے تھوک نگلا۔ وہ غراتی آواز میں بولی۔ "اشرفی! میں کیا پوچھ رہی ہوں تم سے' یہ خط تم نے لکھا ہے؟"

"نن۔ نہیں۔" وہ ڈر کر مکر گیا مگر اس کے انکار کا انداز ہی گواہی دے رہا تھا کہ وہ اقرار کر رہا ہے۔

نشاط نے ایک بار پھر خط اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور پھٹی ہوئی آواز میں بولی "اشرفی! یہ خط تم نے لکھا ہے اور مجھے لکھا ہے۔ مجھے لکھا ہے۔ کمینے کتے بد خصلت!"

اس کے ساتھ ہی ہانڈی میں پھیرنے والی ڈوئی اس کے ہاتھ آ گئی۔ وہ مضبوط لکڑی کی ڈوئی بے دریغ اس کے جسم پر برسانے لگی' ساتھ ساتھ وہ چیخ رہی تھی "بے غیرت تجھے شرم نہ آئی۔ تیری آپا سے ایک سال بڑی ہوں میں۔ میرے بارے میں۔ میرے بارے میں تُو نے ایسے گندے انداز سے سوچا۔ کمینے.......... پاجی!"

وہ چیختی جا رہی تھی اور اسے مارتی جا رہی تھی۔ ڈوئی ٹوٹ گئی۔ اس نے اشرف کے سینے پر دوہتڑ مارا اور دروازہ کھول کر اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ سیڑھیوں تک لڑھک گیا۔ یہ دیکھ کر اشرف کا خون بالکل ہی خشک ہو گیا کہ سیڑھیوں کے دوسرے سرے پر ابا جان کھڑے ہیں۔ درحقیقت تھوڑی دیر پہلے وہ نشاط کی آمد کا انداز دیکھ کر ٹھٹک گئے تھے اور ان کے پیچھے ہی پیچھے یہاں چلے آئے تھے۔

اشرف کے والد صاحب کو دیکھ کر نشاط ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی پھر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ یقیناً وہ رو رہی تھی۔

☆=========☆=========☆

بعد ازاں نشاط نے اشرف کے کرتوت چھپانے کی کوشش کی لیکن جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اشرف کے والد صاحب نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور شاید تھوڑا بہت کانوں سے بھی سن لیا تھا۔ اگلے دن صبح تک دونوں گھرانوں کو یہ ساری کی ساری بات معلوم ہو چکی تھی۔ نشاط سے تو جو ٹھکائی ہوئی سو ہوئی' اگلے دن ابا جان نے بھی کمرے میں بند کر کے اس کی خوب خبر لی۔ ان کے جوتے کی ایڑی نے اشرف کے سر پر کئی جگہ "روبڑے" ڈال دیئے۔ اس کے داہنے انگوٹھے پر بھی شدید ضرب آئی۔ دراصل یہ چوٹ کل کی مار کٹائی میں ہی لگ گئی تھی۔ ڈوئی کی ضرب اپنے ہاتھ پر روکنے کی کوشش میں اشرف کا انگوٹھا بری طرح ٹھک گیا تھا۔ دوسرے دن جب ابا جان سے مار پڑی تو انگوٹھے پر پھر چوٹ لگی اور یہ تقریباً ٹوٹ ہی گیا۔

گاؤں جانے کا پروگرام دو دن کے لئے ملتوی ہو گیا تھا۔ رات کو اشرف نے ابا جان اور ماموں کو بند کمرے میں باتیں کرتے سنا۔ ماموں جان کہہ رہے تھے۔ "بھائی جان! غلطیاں بڑوں میں بھی ہیں۔ ایک طرف ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے اسلام کے سنہری اصولوں کے مطابق چلیں۔ دوسری طرف ہم انہیں اسلام والا ماحول بھی نہیں دیتے۔ ہم اسلام کی بس ان باتوں پر عمل کرتے ہیں جو ہماری مرضی کے مطابق ہوں۔ اب دیکھیں ساتھ والے حاجی برکات کے بڑے بیٹے کی عمر تیس سے کم نہیں ہے لیکن انہوں نے اس کی شادی نہیں کی۔" غم و غصے کا چڑھا ہوا دریا کچھ اترا تو دوسرے روز شام کو ابا جان نے اسے کمرے میں بٹھا کر قریباً دو گھنٹے لیکچر دیا۔ اس لیکچر کا خلاصہ یہی تھا کہ یہ اس کے لئے سدھرنے کا آخری موقع ہے۔ اگر وہ سدھر گیا تو ٹھیک ہے ورنہ اس کے ساتھ جو کچھ ہو گا وہ دنیا دیکھے گی۔ اشرف بس روتا رہا اور اقرار میں سرہلاتا رہا۔

اس دن امی بھی اسے گلے سے لگا کر دیر تک سسکیاں لیتی رہیں۔ وہ درد بھرے لہجے میں بولیں۔ "وے اشرفی! گاؤں میں تو سارے تیری مثالیں دیا کرتے تھے' یہاں آ کر تُو کیا بن گیا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ کچھ دن پہلے تُو نے کسی ایسی ہی بات پر اپنی مامی بلقیس کو بھی سخت ناراض کیا ہے۔ تُو کیوں کر رہا ہے ایسا۔ تُو تو نیک ماں باپ کی اولاد ہے۔ اپنے بہن

اشرف کے والد صاحب کو دیکھ کر نشاط ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی پھر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ یقیناً وہ رو رہی تھی۔

☆========☆========☆

بعد ازاں نشاط نے اشرف کے کرتوت چھپانے کی کوشش کی لیکن جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اشرف کے والد صاحب نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور شاید تھوڑا بہت کانوں سے بھی سن لیا تھا۔ اگلے دن صبح تک دونوں گھرانوں کو یہ ساری کی ساری بات معلوم ہو چکی تھی۔ نشاط سے تو جو ٹھکائی ہوئی سو ہوئی' اگلے دن ابا جان نے بھی کمرے میں بند کر کے اس کی خوب خبر لی۔ ان کے جوتے کی ایڑی نے اشرف کے سر پر کئی جگہ "روبڑے" ڈال دیئے۔ اس کے داہنے انگوٹھے پر بھی شدید ضرب آئی۔ دراصل یہ چوٹ کل کی مار کٹائی میں ہی لگ گئی تھی۔ ڈوئی کی ضرب اپنے ہاتھ پر روکنے کی کوشش میں اشرف کا انگوٹھا بری طرح ٹھک گیا تھا۔ دوسرے دن جب ابا جان سے مار پڑی تو انگوٹھے پر پھر چوٹ لگی اور یہ تقریباً ٹوٹ ہی گیا۔

گاؤں جانے کا پروگرام دو دن کے لئے ملتوی ہو گیا تھا۔ رات کو اشرف نے ابا جان اور ماموں کو بند کمرے میں باتیں کرتے سنا۔ ماموں جان کہہ رہے تھے۔ "بھائی جان! غلطیاں بڑوں میں بھی ہیں۔ ایک طرف ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے اسلام کے سنہری اصولوں کے مطابق چلیں۔ دوسری طرف ہم انہیں اسلام والا ماحول بھی نہیں دیتے۔ ہم اسلام کی بس ان باتوں پر عمل کرتے ہیں جو ہماری مرضی کے مطابق ہوں۔ اب دیکھیں ساتھ والے حاجی برکات کے بڑے بیٹے کی عمر تیس سے کم نہیں ہے لیکن انہوں نے اس کی شادی نہیں کی۔" غم و غصے کا چڑھا ہوا دریا کچھ اترا تو دوسرے روز شام کو ابا جان نے اسے کمرے میں بٹھا کر قریباً دو گھنٹے لیکچر دیا۔ اس لیکچر کا خلاصہ یہی تھا کہ یہ اس کے لئے سدھرنے کا آخری موقع ہے۔ اگر وہ سدھر گیا تو ٹھیک ہے ورنہ اس کے ساتھ جو کچھ ہو گا وہ دنیا دیکھے گی۔ اشرف بس روتا رہا اور اقرار میں سر ہلاتا رہا۔

اس دن امی بھی اسے گلے سے لگا کر دیر تک سسکیاں لیتی رہیں۔ وہ درد بھرے لہجے میں بولیں۔ "وے اشرفی! گاؤں میں تو سارے تیری مثالیں دیا کرتے تھے' یہاں آ کر تو کیا بن گیا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ کچھ دن پہلے تُو نے کسی ایسی ہی بات پر اپنی مامی بلقیس کو بھی سخت ناراض کیا ہے۔ تُو کیوں کر رہا ہے ایسا۔ تُو تو نیک ماں باپ کی اولاد ہے۔ اپنے بہن بھائیوں کو دیکھ۔ اپنے بڑوں کو دیکھ۔"

اشرف بس سر جھکا کر بیٹھا رہا اور آنکھیں پونچھتا رہا۔ اس کی گردن پر جیسے کسی نے شرم کی ایک بہت بھاری گٹھڑی رکھ دی تھی۔

امی کی نگاہ اس کے زخمی انگوٹھے پر پڑی تو کئی اور موٹے موٹے آنسو ان کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ انہوں نے اس کے انگوٹھے کو چوما اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولیں۔ "تجھے پتا ہے تیرے ابا غصے کے کتنے تیز ہیں۔ اب ایسا کچھ نہ کرنا جس سے تیری ماں مرنے والی ہو جائے........... اور چل میرے ساتھ ابھی اسی وقت........... چل کر نشاط سے معافی مانگ۔"

اس رات اشرف کو نشاط سے معافی مانگنی پڑی۔ اگلے روز سہ پہر کے وقت وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ گاؤں چلا گیا۔

☆=========☆=========☆

گاؤں سے واپسی میں تین چار دن لگ گئے۔ اشرف نے بال چھوٹے کرا لئے تھے۔ فلمیں نہ دیکھنے کا عہد کر لیا تھا اور گھر والوں کے سامنے نماز بھی پڑھ لیتا تھا۔ اس کا انگوٹھا اور ہتھیلی کا کچھ حصہ بدستور پٹی میں جکڑا ہوا تھا۔ رات کو کسی وقت شدید درد ہونے لگتا تھا۔ لاہور واپس آ کر اشرف کے ماموں نے اسے اپنے ساتھ لے جا کر اس کا ایکسرے بھی کروایا تھا۔ ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ انگوٹھے کی ہڈی میں فریکچر ہے' تھوڑا سا وقت لگے گا لیکن خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔

امی کو بڑی فکر تھی' یہی ہاتھ لکھنے والا تھا اور امتحان بھی قریب آ رہے تھے۔ ایک دن نشاط ان کے گھر آئی۔ وہ اشرف کی تیمارداری کرنے آئی تھی' مگر اس کی آمد کی خبر سن کر اشرف گھر کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہ دو گھنٹے بعد واپس آیا تو نشاط جا چکی تھی۔ امی نے اسے بتایا کہ نشاط ایک بڑے اچھے پہلوان کا پتا بتا کر گئی ہے۔ دو مہینے پہلے اس کی والدہ کی کلائی ٹوٹی تھی تو اسی پہلوان سے آرام آیا تھا۔

اگلے روز اشرف کی امی بہت اصرار کے ساتھ اشرف کو اس پہلوان کے پاس لے گئیں۔ وہ شاہی قلعے کے قریب ایک گنجان بازار میں بیٹھتا تھا اور اسے خلیفہ رمضان کہا جاتا تھا۔ خلیفہ رمضان نے اشرف کا انگوٹھا دیکھا اور بڑی اچھی طرح پٹی باندھ دی۔ اس نے اشرف کو بتایا کہ اسے ہر دوسرے روز پٹی کے لئے آنا پڑے گا۔

اشرف نے امتحان کی تیاری کے لئے ایک ٹیوشن سینٹر میں جانا شروع کر دیا تھا۔ روز و شب میں ایک تبدیلی سی آگئی تھی۔ ڈیڑھ دو ماہ اسی طرح گزر گئے۔ اس دوران میں اس کا امتحان بھی ہو گیا۔ امتحانات کے بعد فراغت ہی فراغت تھی۔ ایک بار پھر دوستوں سے تھوڑا بہت میل ملاپ شروع ہو گیا۔ خیر سے جہانگیر بھی کراچی سے واپس آگیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے بعد یہاں کیا ہوا ہے۔

جہانگیر کی صحبت ہمیشہ سے اشرف کے فکر و عمل میں تبدیلی لاتی تھی۔ عموماً یہ تبدیلی منفی ہی ہوتی تھی۔ فلم دیکھے ہوئے قریباً دو مہینے گزر چکے تھے۔ اشرف کے اندر فلم بینی کے حوالے سے ایک خلا سا پیدا ہو چکا تھا۔ اسے فلم کی پیاس بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک دن اپنے مشترکہ دوست ٹیڈی کے گھر ان دونوں نے وڈیو پر ارمان کی ایک تازہ فلم دیکھی۔ اس فلم کی بڑی شہرت تھی کیونکہ اس فلم کی ہیروئن کے علاوہ پروڈیوسر بھی وہ خود تھی۔ اس فلم میں ارمان نے واقعی بڑا دبنگ کام کیا تھا۔ فلم میں بے شمار گانے تھے اور ہر گانے میں اس نے پندرہ پندرہ لباس تبدیل کئے تھے۔ تاہم غور کیا جاتا تو ان پندرہ لباسوں پر بمشکل دو تین لباسوں کا کپڑا ہی لگا تھا۔

فلم بینی اور ٹیلی ویژن بینی کی دبی ہوئی چنگاری دیکھتے ہی دیکھتے پھر بھڑک اٹھی۔ وہ چپکے چپکے جہانگیر اور ٹیڈی کے ساتھ سینما بھی جانے لگا۔ ہوش ربا اداؤں والی ارمان اشرف کو ایک روگ کی طرح لگ چکی تھی۔ ایک بار پھر یہ روگ اشرف کے اندر شدت پکڑنے لگا۔ اس کا فطری تجسس اسے عورت کے حوالے سے بے قرار کرنے لگا۔ اب وہ نویں میں تھا' قد بھی تھوڑا سا اور نکل آیا تھا لیکن دیکھنے میں وہ اب بھی نو عمر لڑکا تھا۔

ڈھائی تین مہینے گزرنے کے باوجود اب بھی چوتھے پانچویں روز اشرف اپنا انگوٹھا دکھانے خلیفہ رمضان کے پاس جاتا تھا۔ شاہی قلعے کے قریبی علاقے میں آمدورفت کے دوران میں اشرف نے کچھ عجیب سے مناظر دیکھے تھے۔ چونکہ اکثر وہ اکیلا ہی ہوتا تھا اس لئے اس کا تجسس اسے کشاں کشاں ارد گرد کی گلیوں میں پھراتا رہتا تھا۔ یہاں اس نے رنگ برنگ کپڑے پہنے ہوئے عورتوں کو دیکھا تھا۔ ان کے چہروں پر سرخی پوڈر کی لیپا پوتی ہوتی تھی۔ وہ دروازوں اور کھڑکیوں میں کھڑی راہ گیروں کو عجیب و غریب اشارے کرتی تھیں۔ کچھ گھروں کے اندر سے گانے بجانے کی آوازیں بھی آتی تھیں۔ جلد ہی اشرف کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ وہی بازار حسن ہے جس کے مناظر اس نے پاکستان اور انڈیا کی فلموں

میں دیکھے ہیں۔ جب اسے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ بازار حسن ہے تو پھر اسے سب کچھ معلوم ہو گیا۔

اس نے جہانگیر اور طوطے کو اس بارے میں بتایا تو جہانگیر فوراً بولا۔ ”اوئے باندر! ادھر تو سنا ہے پولیس پھرتی ہے۔ بڑی عمر کے بندوں کی اور بات ہے' لڑکوں کو تو پکڑ کر فوراً بند کر دیتے ہیں۔“

”تم بالکل ڈرپوک ہو۔“ طوطے نے فوراً کہا۔ ”میں نے وہاں اپنے سے بھی آدھی عمر کے لڑکے دیکھے ہیں۔ ویسے بھی ہر مزیدار کام میں تھوڑا بہت خطرہ تو ہوتا ہے۔“

اس دن بازار حسن کے بارے میں ان تینوں کے درمیان دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور اشرف کے اندر چپکے چپکے ایک بے پناہ تجسس پروان چڑھتا رہا۔ چند ماہ پہلے ”تحفہ“ فلم دیکھ کر اس کے اندر جو آگ بھڑکی تھی' وہ پھیلتے پھیلتے اب جنگل کی آگ بن گئی تھی۔

وہ سرما کا ایک ابر آلود دن تھا۔ کسی وقت ہلکی بوندیں بھی پڑنے لگتی تھیں۔ اشرف کی جیب میں سو روپے کا ایک کڑکتا ہوا نوٹ تھا۔ اس کے علاوہ دس دس کے پانچ نوٹ تھے۔ اس نے خلیفہ رمضان سے انگوٹھے کی آخری پٹی کروائی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے نہایت ”طاقت ور تجسس“ نے بڑی مضبوطی سے اس کی انگلی پکڑی اور اسے بازار حسن کی ایک اندرونی گلی میں لے گیا۔ گاؤں رنگی کے سب سے نیک نام شخص قدرت اللہ صاحب کا چودہ سالہ لڑکا دنیا کا بدنام ترین سودا خریدنے کے لئے بدنام ترین بازار میں کھڑا تھا۔ اس کی جیب میں وہ ایک سو تیس روپے تھے جو اس نے جیب خرچ سے بچا بچا کر رکھے تھے۔ اس کے سینے میں اس کا دل بے پناہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ بازار کے سرے پر کھڑا تھا۔ بازار کے اندر جھروکے سجے تھے اور بھاؤ تاؤ ہو رہے تھے۔ وہ کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ بازار کے اندر داخل ہونا چاہتا تھا مگر اس کے پاؤں منوں وزنی ہو گئے تھے۔ چند قدم کا فاصلہ صدیوں کا فاصلہ بن گیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ برسوں اسی طرح کھڑا رہے گا لیکن قدم آگے نہیں بڑھا سکے گا۔ یہ کیسی قربت تھی اور کیسی دوری تھی۔ اس کا تجسس اسے بے پناہ قوت سے کھینچ رہا تھا' اس کے نو عمر ذہن میں خیمہ زن جھجک نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ کافی دیر لگی مگر بہرحال فیصلہ ہو گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے خاص الخاص بازار میں داخل ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ جب بندہ بوکھلایا ہوا ہو تو اس سے اکثر الٹا کام ہی ہوتا ہے۔ اشرف

سے بھی الٹا کام ہوا۔ وہ ایک دروازے میں داخل ہوا۔ اس کے کان شائیں شائیں کر رہے تھے اور ارد گرد کی ہر شے نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ ایک عورت اس کے سامنے آئی۔ وہ درمیانی عمر کی فربہ اندام عورت تھی۔ کانوں میں بڑے بڑے جھمکے چمک رہے تھے۔

"آؤ سرکار آؤ۔" اس نے اشرف کو اوپر سے نیچے تک گھورتے ہوئے کہا۔

اشرف گنگ کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔

عورت کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "فرماؤ جی۔ جناب کی کیا خدمت کریں؟"

اشرف خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ اشرف کی صورت دیکھ کر عورت ہنسی اور اس کے پان سے رنگے ہوئے دانت نمایاں ہو گئے۔ وہ اشرف کو بازو سے پکڑ کر اندر لے گئی۔ یہاں ایک بڑا سرخ قالین بچھا تھا اور دیواروں کے ساتھ گاؤ تکئے لگے تھے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ موسیقی کے بہت سے ساز پڑے تھے عورت نے اشرف کو ایک جانب صوفے پر بٹھایا۔ اب ایک اور عورت نما لڑکی بھی وہاں آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے تھے اور پاؤں میں گھنگھرو بندھے تھے۔ وہ پنجابی لہجے میں اردو بولتے ہوئے کہنے لگی۔ "ہاں باؤ جی! کیا سنائیں آپ کو۔ فلمی گانا' گیت' غزل یا کچھ اور؟"

اشرف کو یوں لگا جیسے وہ کسی غلط دکان پر آگیا ہے' لیکن یہ سوچ اس کی زبان پر نہ آسکی۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ تک تک دیدم.......... دم نہ کشیدم۔

عورت نما لڑکی نے پھر کہا۔ "ہائے ہائے باؤ! تم کچھ بولو گے بھی کہ نہیں؟"

"وہ.......... وہ دراصل.......... میں.......... لیکن۔" وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

درمیانی عمر کی عورت کے چہرے پر اب تھوڑی سی سختی آئی تھی۔ اس نے کہا۔ "یہ بکری کی طرح میں میں کیا کر رہے ہو۔ جو دل میں ہے بتاؤ۔"

اشرف کا حلق سوکھ گیا تھا۔ اسے حلق تر کرنے کے لئے پانی کی ضرورت تھی۔ میز پر اس کے سامنے کوک کی ٹھنڈی بوتل رکھ دی گئی تھی' مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ہاتھ آگے بڑھا کر بوتل اٹھا سکتا۔

گھنگھروؤں والی لڑکی بولی۔ "میں سمجھ گئی ہوں' یہ بلونگڑا کیوں چکرایا ہوا ہے۔ گانا شانا سننے کے لئے نہیں آیا۔"

موٹی عورت اسے گھورتے ہوئے بولی۔ "تماش بینی کرنے سے پہلے اپنے کسی بڑے

سے طور طریقے پوچھ لیتے ہیں۔ چلو اٹھو یہاں سے چلو۔" وہ چٹکی بجاتے ہوئے بولی۔

اشرف ایک دم یوں کھڑا ہو گیا جیسے صوفے نے ڈنک مار دیا ہو۔ گھنگھروؤں والی نے کہا۔ "کاکا جی! تم جس کام کے لئے آئے ہو وہ یہاں نہیں ہوتا۔ یہاں صرف گانا بجانا ہوتا ہے۔"

موٹی عورت نے تحکم سے کہا۔ "چل جلدی سے بوتل کے پیسے نکال۔"

"وہ.......... وہ.......... دراصل.......... میں۔" وہ پھر ہکلا کر رہ گیا۔

"اوئے پیسے نکال پھر بکری کی طرح میں میں کرنے لگا ہے۔"

اس نے زبردستی اشرف کی جیب میں ہاتھ گھسایا اور دس دس کے دو نوٹ نکال کر اسے دروازے کی طرف دھکا دیا۔

بے عزتی کے شدید احساس کے زیر اثر اشرف نے گھوم کر موٹی عورت کی طرف دیکھا۔ وہ چیخ کر بولی۔ "اوئے ڈیلے نکال کر کیا دیکھ رہا ہے۔ ایک جھانپڑ دوں گی۔ چل بھاگ یہاں سے۔"

اس نے اشرف کو ایک اور دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا سا گلی میں آگیا۔ باہر کئی مسکراتی نظروں نے اسے دیکھا۔ اشرف کو لگا جیسے اس کے جسم کے ہر مسام سے پسینہ بہہ نکلا ہے۔ وہ تصور کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا کہ ساری دنیا کے لوگوں کی انگلیاں اس کی طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ وہ بیک زبان کہہ رہے ہیں۔ "وہ دیکھو۔ وہ ہے قدرت اللہ صاحب کا بیٹا۔ یہ نویں جماعت میں پڑھتا ہے اور یہ ہیرا منڈی میں کنجریوں کے دھکے کھا رہا ہے۔" وہ بڑی تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اسے اپنے عقب میں چند قہقہے سنائی دیئے۔ پتا نہیں یہ قہقہے اس پر لگائے گئے تھے یا نہیں لیکن وہ اس کے کانوں تک ضرور پہنچے۔

خبر نہیں کہ کیا ہوا' ایک مرتبہ سخت بے عزت ہونے کے بعد اس کی جھجک ختم ہو گئی۔ اس کے پاؤں جو کچھ دیر پہلے منوں وزنی ہو چکے تھے' بڑی حد تک ہلکے ہو گئے۔ گلی کے ایک خم نے اسے اس مقام سے اوجھل کر دیا تھا جہاں وہ لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے باہر آیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اب اس کے قدم کافی اعتماد سے اٹھ رہے تھے۔ اس کے دونوں جانب حسن کے سیل پوائنٹ تھے۔ فروخت کا مال ڈھلے کے لئے جھروکوں اور دروازوں میں سجا تھا۔ وہ کن انکھیوں سے سجی بنی عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

ایک دروازے کی بیرونی سیڑھیوں پر ایک نسبتاً جواں سال لڑکی کی طرف بڑھا اور اس کے

ساتھ کمرے میں گھس گیا۔ یہ دو کمروں پر مشتمل چھوٹا سا گھر تھا۔ در و دیوار میں ایک عجیب طرح کی باس رچی ہوئی تھی۔ یہاں گانے بجانے کا سامان اشرف کو دکھائی نہیں دیا۔ اس کو تسلی ہو گئی۔

☆=========☆=========☆

تارا کو اشرف شروع سے ہی اچھا لگتا تھا۔ رنگی گاؤں میں وہ دونوں اکٹھے کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ اگر اشرف کچھ دنوں کے لئے کہیں چلا جاتا تھا تو عجیب سی بے قراری تارا کے دل و دماغ پر مسلط ہو جاتی تھی۔ وہ چھوٹی تھی لہٰذا اس بے قراری کی وجہ نہیں جانتی تھی' نہ ہی وہ اس بے قراری کو کوئی نام دے سکتی تھی.......... مگر اب کچھ عرصے سے اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس میں اور اشرف میں کوئی ایسا تعلق ہے جو عام لوگوں میں نہیں ہوتا۔

چند ماہ پہلے تک سب کچھ ٹھیک تھا' مگر پھر اوپر تلے دو ایسے واقعات ہوئے تھے جس نے بہت کچھ درہم برہم کر دیا تھا۔ ان دنوں اشرف کے رویے میں تارا کو عجیب طرح کی تبدیلی نظر آئی تھی۔ وہ ان کے گھر کثرت سے آتا تھا اور تارا کو عجیب سی نظروں سے دیکھتا تھا پھر ایک دو بار تنہائی میں اس نے عجیب سی باتیں کی تھیں۔ فلم کی کہانی سناتے سناتے اس نے فلموں ڈراموں والی حرکتیں بھی شروع کر دی تھیں۔ ایسے لمحوں میں وہ تارا کو بالکل اجنبی اور بیگانہ سا لگا تھا۔ اس کے رویے نے تارا میں بیزاری پیدا کی تھی پھر اس دن امی نے بھی سب کچھ دیکھ لیا تھا اور تارا کے سامنے ہی اشرف کو زور دار تھپڑ بھی مارا تھا۔ تارا کئی دن تک خوف زدہ اور سہمی ہوئی رہی تھی۔

اس واقعے کے بعد اشرف کے ساتھ اس کی بات چیت بہت کم ہوئی تھی۔ وہ پھپھو کے گھر بھی کم ہی جاتی تھی۔ امی نے اسے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ وہ اکیلی پھپھو کے گھر نہیں جائے گی پھر کچھ ہی دن بعد وہ باجی نشاط والا واقعہ ہو گیا تھا۔ اس واقعے نے تارا کو اندر تک ہلا دیا تھا۔ وہ کئی دن تک کمرے میں گھس کر چپکے چپکے روتی رہی تھی۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھرتا تھا۔ "اشرف ایسا کیوں ہو گیا ہے۔ وہ تو اتنا اچھا تھا' پھر کیوں ایک دم اتنی ساری برائی اس کے اندر اکٹھی ہو گئی ہے۔ اس نے باجی نشاط کے ساتھ پتہ نہیں کیسی بدتمیزی کی تھی جس کی وجہ سے باجی نشاط اور پھوپا جان سے اتنی مار پڑی۔"

وہ نماز پڑھ کر اکثر دعا مانگتی تھی۔ "اے اللہ میاں! اشرف کو پھر سے اچھا کر دے۔ اسی طرح ہنستا مسکراتا اور پیاری پیاری باتیں کرتا ہوا اشرف۔ اس کے دماغ میں سے ہر قسم کی برائی ختم ہو جائے۔ وہ وہی کچھ کرے جو پھوپا اور دوسرے "بڑے" اس سے کہتے ہیں۔"

جب وہ لوگ گاؤں میں تھے اس نے کئی بار اپنے بڑوں کی زبان سے اڑتی اڑتی سی بات سنی تھی کہ تارا کی شادی اشرف سے ہو گی۔ ایسی بات سن کر وہ بے وجہ شرما جایا کرتی تھی۔ گاؤں میں گھر کے اندر چھوٹے چھوٹے کھیل کھیلتے ہوئے جب کبھی اشرف اور تارا کے درمیان جھگڑا ہو جاتا تھا تو اشرف کہا کرتا تھا۔ "اگر تم نے میری بیوی بن کر اس طرح جھگڑا کیا تو پھر میں تمہیں خوب مارا کروں گا اور تمہیں ٹھیک کر دوں گا۔"

وہ اس کا منہ چڑاتے ہوئے کہتی تھی۔ "میرا دماغ خراب ہے کہ میں تم سے شادی کروں گی۔ میری شادی تو کسی بہت بڑے ڈاکٹر سے ہو گی۔"

دونوں کا جھگڑا مزید بڑھ جاتا تھ مگر پھر جلد ہی صلح بھی ہو جاتی تھی۔ وہ دونوں زیادہ دیر ایک دوسرے کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔

تارا کے ذہن میں اشرف اب بھی اسی طرح براجمان تھا جس طرح گاؤں میں تھا۔ ابھی صرف چار پانچ دن پہلے' جب قاری صاحب انہیں ایک حدیث کی تشریح سمجھا رہے تھے اور انہوں نے تارا کو تشریح کی ایک سطر پڑھنے کے لئے کہا تو وہ بری طرح اٹک گئی۔ سطر اس طرح تھی۔ "اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔" اس سطر میں اشرف کا لفظ تھا لہٰذا تارا کی زبان ایک دم لڑکھڑا گئی۔ قاری صاحب نے ڈانٹا تو اس نے بڑی مشکل سے سطر مکمل کی۔

آج بھی موسم ابر آلود تھا۔ ہلکی بوندا باندی کے سبب ٹھنڈ میں قدرے اضافہ ہو گیا تھا۔ اسکول سے چھٹی تھی۔ اصغر باہر کرکٹ کھیلنے گیا ہوا تھا۔ تارا امی کا ہاتھ بٹانے کے بعد دس بجے سے لحاف میں گھسی بیٹھی تھی اور اشرف کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ اچانک امی کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔ "تارا لحاف چھوڑ دے دوپہر ہو گئی ہے۔"

"امی بات دوپہر کی نہیں ہوتی ٹھنڈ کی ہوتی ہے اور ٹھنڈ تو صبح کی طرح ہی ہے۔ آپ بھی لحاف میں آ جائیں۔"

امی ذرا تذبذب میں رہیں پھر وہ بھی لحاف میں تارا کے پاس بیٹھ گئیں اور اس کے نہایت گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ امی کا اچھا موڈ دیکھ کر تارا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "امی! اب ہم پھپو کے گھر زیادہ کیوں نہیں جاتے۔ وہ بھی ذرا کم ہی آتی ہیں۔"

"آتی تو ہیں' ابھی پچھلے ہفتے آئی تھیں مگر تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"بب.......... بس ویسے ہی امی۔"

اس کی امی نے دھیان سے اسے دیکھا اور ذرا خشک لہجے میں بولیں۔ "دیکھو طاہرہ! تم صرف اپنی پڑھائی کی طرف دھیان رکھو۔ الٹی سیدھی باتیں مت سوچا کرو اور اس دن مجھے تمہاری یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ تم نے پھپو سے کیوں پوچھا تھا کہ اشرف کہاں ہے۔ تمہیں اس کی طرف سے فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

تارا سہم کر خاموش ہو گئی۔ اس کی امی سمجھانے والے انداز میں اس سے باتیں کرنے لگیں۔

☆==========☆==========☆

اشرف ساڑھے چودہ سال کی عمر میں ہی مرد بننا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے وہ پھل چکھ لیا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جو چکھے وہ پچھتاتا ہے اور جو نہ چکھے وہ بھی پچھتاتا ہے۔ اس روز پولیس والوں سے ڈر کر وہ جس دروازے میں داخل ہوا تھا' وہاں اس کی ملاقات ممتاز عرف رانو نامی لڑکی سے ہوئی تھی۔ رانو کا رنگ گندمی تھا۔ جسم پتلا تھا اور کئی جگہ ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں' بہرحال اس کے نقش برے نہیں تھے۔ اس روز رانو نے اس کی جیب ہلکی کر دی تھی اور اسے بھی ہلکا کر دیا تھا۔ تجسس اور بے قراری کی وہ بھاری گٹھڑیاں اس کے سر سے اتار دی تھیں جن کے بوجھ تلے وہ پسا جا رہا تھا۔

اس روز کے بعد اشرف وقفے وقفے سے یہاں آنا شروع ہو گیا۔ شروع میں اسے پولیس والوں سے خوف آتا تھا اور راہ گیر بھی بردہ فروش لگتے تھے' مگر بتدریج اس کا خوف کم ہو گیا۔ جونہی اس کے پاس معقول پیسے اکٹھے ہوتے وہ خلیفہ رمضان کو انگوٹھا دکھانے کے بہانے شاہی قلعے کا رخ کرتا اور شاہی قلعے جانے کی بجائے رانو کے پاس جا پہنچتا۔ رانو نے پتا نہیں اسے کیا پلا دیا تھا' وہ ہروقت رانو کے بارے میں ہی سوچتا رہتا تھا۔ ارمان' تارا' نشاط' وقتی طور پر سب کچھ پس منظر میں چلا گیا تھا.......... لیکن نہیں۔ شاید ارمان پس منظر میں نہیں گئی تھی۔ وہ تو جان چھوڑنے والا روگ ہی نہیں تھی۔ جب وہ

رانو کے پاس ہوتا تو کمرے کی نیم تیرگی میں اسے رانو کی گندمی صورت میں بھی ارمان کا جگمگ کرتا ہوا چہرہ ہی دکھائی دیتا۔ رانو اسے چھوٹے بالم کہہ کر پکارتی تھی۔ جب وہ اس کی کوٹھڑی میں داخل ہوتا تو وہ سب سے پہلے اس کی جیب ٹٹولتی پھر اسے لے کر چارپائی پر بیٹھ جاتی۔ وہ کچھ دیر اس سے باتیں کرتی رہتی' لگتا تھا کہ وہ بھی اس میں تھوڑی بہت دلچسپی لینے لگی ہے۔ پانچ دس منٹ کی گفتگو کے بعد کمرے کی تیز لائٹ بجھ جاتی۔

رانو کی قربت اشرف کے جذبات کے بہاؤ کو معمول پر لے آتی تھی۔ کسی وقت تو اسے یہ لگتا تھا کہ دنیا میں رانو سے بہتر عورت کوئی ہے ہی نہیں۔

ایک دن رانو نے اس سے پوچھا۔ "چھوٹے بالم! تیرا کوئی یار دوست نہیں؟"

"بس تھوڑے سے ہیں۔"

"کون کون؟"

"ایک ٹیڈی ہے' ایک جہانگیر اور ایک طوطا۔"

"تو ان میں سے کوئی تیری طرح دلیر مرد نہیں ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"ان میں سے کسی کو ساتھ کیوں نہیں لاتا؟"

"دراصل۔ دراصل۔"

"اچھا میں سمجھ گئی۔ تُو بڑا خچرا ہے۔ تُو نے ان میں سے کسی کو بتایا ہی نہیں۔"

اشرف نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولی۔ "پھر تُو ہی ذرا جلدی جلدی آیا کرنا۔ میں دو دو ہفتے تیرا انتظار کرتی رہتی ہوں۔"

"تت.......... تیرے پاس پیسے دینے والے اور بھی تو آتے ہیں۔"

"مجھے ان کے پیسے اچھے نہیں لگتے۔ تیرے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔" وہ بات بدل کر بولی۔

"کیا مطلب ہے تیرا؟"

"چھوٹے بالم تم بڑے صاف ستھرے اور پیارے سے ہو۔ جو دوسرے آتے ہیں' وہ تو بیماریوں کے گھر ہوتے ہیں۔ بری بری صورتیں' بری بری آوازیں' ان کے منہ سے ایسی بدبوئیں آتی ہیں کہ بس اللہ معافی۔"

اشرف کافی تجربے کار ہو چکا تھا‘ پھر بھی اس کے اندر وہ بھولپن پوری طرح مرا نہیں تھا جس کا تعلق اس کی عمر سے تھا۔ وہ رانو کے دیئے ہوئے سگریٹ کا کش لگا کر بولا۔ ”اگر میں کسی وقت کہیں سے تجھے بہت سے روپے لادوں تو کیا تم اس بازار میں بیٹھنا چھوڑ دو گی؟“

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے عام سے انداز میں کتنا بڑا سوال پوچھ لیا ہے۔ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب صدیوں سے ڈھونڈا جا رہا تھا۔ وہ مسکرائی۔ ”جب تم لاؤ گے پھر دیکھوں گی۔“

بڑی خاموشی اور رازداری کے ساتھ اشرف نے رانو کے پاس جانا جاری رکھا۔ وہ اکثر اسکول سے بھی غیر حاضر ہو جاتا تھا۔ رانو چاہتی تھی کہ وہ ہفتے میں ایک بار تو اس کے پاس ضرور آئے۔ اشرف پانچ چھ دن پیسے جمع کرتا رہتا تھا مگر عموماً وہ کم پڑ جاتے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ وہ کبھی کبھی امی کی الماری سے بھی پیسے نکالنے لگا۔ سودا لینے بازار جاتا تو اس میں سے پیسے بچانے کی کوشش کرتا۔ رانو کی قربت اس کی ضرورت بنتی جا رہی تھی‘ بالکل جیسے آہستہ آہستہ سگریٹ اس کی ضرورت بن گیا تھا‘ اور فلمیں اس کی ضرورت بن گئی تھیں اور ٹیڈی طوطا وغیرہ اس کی ضرورت بن گئے تھے۔ بہرحال یہ اشرف کی سمجھ داری تھی کہ اس نے ابھی تک اپنے قریب ترین دوستوں سے بھی بازارِ حسن والی بات چھپا رکھی تھی۔ اس کا انگوٹھا کب کا ٹھیک ہو چکا تھا مگر وہ اب بھی کبھی کبھی درد کی شکایت کرتا رہتا تھا۔ ایسے میں امی چپکے سے اسے بیس تیس روپے دے دیتی تھیں اور کہتی تھیں کہ جاؤ خلیفہ رمضان سے پٹی کروا آؤ۔

فلمیں دیکھنے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ فلمیں دیکھنے کے لئے ایک بڑا اچھا اڈا اشرف اور جہانگیر کے ہاتھ آ گیا تھا۔ طوطے نے اسکول جانا چھوڑ دیا تھا اور مکمل طور پر موٹر مکینکی شروع کر دی تھی‘ وہ جس ورکشاپ میں کام کرتا تھا اس کا مالک استاد جیدا نامی ایک شخص تھا بلکہ اسے نوجوان ہی کہنا چاہئے۔ وہ خود بھی فلموں کا بڑا رسیا تھا۔ اس نے ورکشاپ کی چھوٹی سی چھت پر جہازی سائز کی تین ڈشیں لگا رکھی تھیں۔ پچھلے کمرے میں ہر وقت ٹی وی چلتا رہتا تھا اور دھڑا دھڑ ہندوستانی اور انگریزی فلمیں آتی رہتی تھیں۔ اکثر جب اشرف اسکول کے لئے گھر سے نکلتا تھا تو جہانگیر کے ساتھ اسی ورکشاپ میں پہنچتا تھا۔ ٹی وی دیکھنے کا معاوضہ تھوڑا ہی ہوتا تھا۔ کبھی استاد جیدے کے لئے ولز کے چار پانچ

سگریٹ........... کبھی چائے کا ایک کپ اور کبھی استاد کی مٹھی چاپی۔ استاد کی آنکھیں سرخ رہتی تھیں۔ جہانگیر نے اسے بڑی رازداری سے بتایا تھا کہ استاد بوتل لگاتا ہے۔

”یہ بوتل کیا ہوتی ہے؟“ اشرف نے پوچھا تھا۔

”یار! تُو اتنا گھوم پھر کر اب بھی تھوڑا تھوڑا پینڈو ہے۔ بوتل کا مطلب ہوتا ہے شراب۔ ابھی پرسوں والی فلم میں دیکھا نہیں تُو نے۔ امیتابھ بچن‘ ریکھا کے ساتھ ڈانس کرتے ہوئے کس طرح گلاس پر گلاس چڑھا رہا تھا۔“

اشرف سر ہلا کر رہ گیا تھا۔ اس کے اندر تجسس کی ایک اور چھوٹی سی لَو بھڑک اٹھی تھی۔

ایک دن جب وہ اسکول سے یعنی استاد جیدے کی ورکشاپ سے چھٹی کر کے گھر پہنچا تو امی کچھ پریشان نظر آئیں۔ اسی دوران میں ممانی بھی اندرونی کمرے سے نکل آئیں۔ ممانی کی زبانی اشرف کو پتا چلا کہ تارا کو سیڑھیاں اترتے ہوئے موچ آ گئی ہے‘ اسے پہلوان کے پاس لے جانا ہے۔ اسی دوران میں دروازے پر ٹیکسی بھی آ کر رک گئی۔

اشرف کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ لوگ خلیفہ رمضان کے پاس جا رہے تھے۔ اشرف اب بھی خلیفہ سے پٹی کرانے کے بہانے امی سے پیسے اینٹھتا تھا حالانکہ خلیفہ کی شکل دیکھے ہوئے اسے تین مہینے ہو چکے تھے۔

امی نے کہا۔ ”اشرف! تم بھی چلو ساتھ۔“

اشرف نے ٹال مٹول کی کوشش کی مگر اس کی امی کے ذہن میں شاید یہ تھا کہ وہ بھی اپنا ہاتھ دکھا لے گا۔ امی نے اصرار کر کے اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

تارا کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور وہ ہائے ہائے کر رہی تھی۔ آج کافی دنوں بعد اشرف نے تارا کو ذرا غور سے دیکھا۔ اس کی رنگت نکھر آئی تھی‘ بال کچھ مزید گھنے ہو گئے تھے اور وہ بڑی بڑی لگنے لگی تھی۔ تارا کے گھنے لمبے بال اشرف کو ہمیشہ سے بہت پسند تھے‘ چند لمحوں کے لئے اس کی نگاہ ان بالوں سے الجھ کر رہ گئی مگر پھر فوراً ہی اسے امی کا خیال آ گیا اور خلیفہ رمضان کا خیال آ گیا اور وہ تارا کو بھول کر پھر سے اپنی پریشانی میں ڈوب گیا۔

وہ لوگ تارا کو لے کر خلیفہ کی دکان پر پہنچے تو اشرف کے ذہن میں ان گنت اندیشے کلبلا رہے تھے۔ خلیفہ نے ماہرانہ انداز میں تارا کے گورے چٹے پاؤں کی موچ نکالی اور

اس پر روئی وغیرہ رکھ کر پٹی باندھ دی۔ اس کے بعد وہی کچھ ہوا جس کا اشرف کو اندیشہ تھا۔ اشرف کی امی نے خلیفہ جی سے کہا۔ "ابھی اشرف کو اور کتنی پٹیاں لگیں گی؟"

"اور پٹیاں کیا مطلب؟" خلیفہ نے حیران ہو کر کہا۔ "پٹیاں تو دو مہینے پہلے ہی ختم ہو گئی تھیں۔ میں نے تیل دیا تھا کہ بس کبھی کبھی لگاتے رہنا۔"

اشرف کی امی نے حیرانی سے اشرف کی طرف دیکھا۔ اس کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ امی نے بے ساختہ کہا۔ "لیکن اشرفی! تم تو ابھی تین دن پہلے مجھ سے پٹی کے پیسے لے کر آئے ہو؟"

"وہ.......... دراصل.......... وہ.........." اشرف ہکلا کر رہ گیا۔

خلیفہ رمضان گہری نظروں سے اشرف کو دیکھ رہا تھا۔ توند پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "لگتا ہے کاکے نے کوئی ڈراما کیا ہے بہن جی کے ساتھ۔" پھر اس نے اشرف کی والدہ کو آنکھوں سے اشارہ کیا اور دکان کے دوسرے حصے میں لے گیا۔ دونوں تین چار منٹ تک وہاں کھسر پھسر کرتے رہے۔ ممانی کی ساری توجہ تارا کی طرف تھی۔ انہوں نے غالباً خلیفہ اور اشرف کی امی کے درمیان ہونے والا شروع کا مکالمہ سنا ہی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد خلیفہ جی واپس آکر اپنی گدی پر بیٹھ گئے۔ امی کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا اور وہ کرخت نظروں سے اشرف کو دیکھ رہی تھیں۔

جیسا کہ اشرف کو بعد میں معلوم ہوا' خلیفہ نے اشرف کی والدہ کو بتایا تھا کہ ایک دو بار اشرف یہاں کی بدنام گلی میں گھومتا دیکھا گیا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ وہ اس پر نظر رکھیں۔ گھر آکر والدہ اشرف پر پھٹ ہی پڑی تھیں۔ انہوں نے زارو قطار روتے ہوئے کہا۔ "تم نے میری زندگی حرام کر دی ہے اشرفی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ تو کم بخت ادھر گاؤں میں ہی رہتا۔ نہ تجھے شہر کی ہوا لگتی نہ تو ان گندگیوں میں گرتا۔ اگر تیرے باپ کو تیری ان آوارہ گردیوں کا پتا لگ گیا تو سچ کہتی ہوں وہ کھڑے کھڑے تیری کھال ادھیڑ دیں گے۔ وہ بڑے عاجز آئے ہوئے ہیں تجھ سے۔"

اشرف بس سر جھکائے کھڑا رہا تھا۔

اس کی والدہ نے اسے بالوں سے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔ "بتا ان پیسوں کا کیا کرتا رہا ہے جو مجھ سے لے جاتا رہا ہے؟"

"وہ جمع کر کے بسنت پر گڈی ڈور لایا تھا۔" اشرف نے سفید جھوٹ بولا۔ گڈی

ڈور کے لئے اسے چپکے سے ماموں نے پیسے دیئے تھے۔

وہ ابا جان' کے سامنے تو پتنگ اڑانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے یہ شوق منٹو پارک جا کر پورا کیا تھا۔

اشرف کی والدہ نے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھیں اور شہادت کی انگلی کھڑی کرتی ہوئی بولیں۔ "دیکھ اشرفی! میں تجھے بس ایک موقع دے رہی ہوں۔ اب اگر مجھے شک بھی پڑا کہ تو اس گندے علاقے کی طرف گیا ہے تو تیرے ابا سے فوراً شکایت کر دوں گی پھر اس کے بعد جو کچھ ہو گا اس کی ذمے دار میں نہیں ہوں گی۔"

اشرف بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے اب اس "وارننگ" سے چڑ سی ہوتی جا رہی تھی۔ آپا عارفہ بھی جب بولتی تھیں' یہی کہتی تھیں' میں ابا جان سے تمہاری شکایت لگا دوں گی۔ بھائی جان اور امی جان کی زبان پر بھی بس یہی فقرہ رہتا تھا۔ اشرف کو ہر وقت یہی محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک تنے ہوئے رسے پر چل رہا ہے۔ یہاں سے گرا تو سیدھا ابا جان کے سامنے گرے گا اور وہ اس پر تھپڑوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دیں گے۔ اشرف کا بہت دل چاہتا تھا کہ وہ ابا جان کے پاس بیٹھے' ہلکے پھلکے انداز میں سب گھر والے ابا جان سے بات چیت کریں۔ ابا جان ان کے ساتھ چھوٹی چھوٹی تفریحات میں شریک ہوں مگر پتا نہیں کیا بات تھی' ابا جان کے پاس ان کے لئے وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔ اگر کسی وقت وہ کوئی بات کرتے بھی تھے تو وہ نصیحت ہوتی تھی' حکم ہوتا تھا یا وارننگ ہوتی تھی آخر ماموں جان بھی تو بزرگ تھے' وہ تارا اور دوسرے بچوں کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے' ہنستے کھیلتے تھے مگر ابا جان کا معاملہ بالکل جدا تھا۔ ان کا ذہن مذہبی تھا لیکن روز بہ روز انتہا پسندی کی طرف مائل تھا۔ وہ کسی معاملے میں ذرا سی لچک رکھنے کو بھی تیار نہیں تھے۔

امی کے سمجھانے بجھانے پر اشرف نے پورا ایک مہینہ اس بازار کا رخ نہیں کیا۔ اس کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ وہ بازارِ حسن میں اپنی آمدورفت کے معاملے کو زیادہ دیر راز نہیں رکھ سکے گا۔ ایک مہینہ تو اس نے کسی طرح کاٹ لیا' مگر پھر اس کی بے قراری حد سے بڑھ گئی۔ دو نادیدہ بانہیں جیسے اپنی پوری قوت سے اسے پرانے راستے کی طرف کھینچ رہی تھیں۔ بہت سی یادیں اس کے ذہن پر حملہ آور تھیں۔ ایک نیم تاریک کمرے کی سیلن زدہ بو' الجھے سلجھے بالوں کا لمس' کان میں گدگدی کرتی ہوئی گرم سانس کی

سرگوشی اور کسی قریبی چار دیواری میں گھنگھروؤں کی چھن چھن۔

ایک دن وہ جیسے کسی تیز آبی ریلے میں بہتا ہوا شاہی قلعے جا پہنچا اور پھر اس بازار میں۔

رانو اسے دیکھ کر ناراض ہوئی اور حیران بھی۔ اس نے سر کے بالوں سے پکڑ کر اشرف کو جھنجوڑا اور بولی۔ "تم بڑے ظالم ہو چھوٹے بالم۔ تمہیں پتا نہیں' مجھ پر کیا بیتی ہے۔ کتنا انتظار کرتی رہی ہوں تمہارا۔"

"میں بیمار ہو گیا تھا۔" اشرف نے وہی بہانہ بنایا جو اسکول نہ جانے پر بناتا تھا۔

رانو' اشرف کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک دم اس نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لئے۔ "چھوٹے بالم۔ اب شاید ہم کبھی نہ مل سکیں۔"

اشرف کا دل دھک سے رہ گیا۔ "کیوں کیا ہوا؟"

"ہوا تو کچھ نہیں' بس سمجھ لے کہ اب ہمارے راستے جدا ہو گئے ہیں۔ اب تم.......... یہاں نہ آیا کرو۔"

"لیکن کیوں۔ ایسی بات کیوں کر رہی ہو تم؟"

"ساری باتیں بتانے والی تو نہیں ہوتیں۔"

"تو کیا مجھ سے بھی چھپاؤ گی؟"

"میرے چھوٹے بالم! میں تجھے کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتی۔ بس میری یہ بنتی ہے کہ اب یہاں نہ آیا کرو۔"

"مجھے وجہ تو بتاؤ' آخر ہوا کیا ہے؟"

وہ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھی رہی' پھر آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "اچھا آج نہیں۔ پرسوں آنا پھر بتاؤں گی۔"

اشرف بوجھل دل لے کر گیا تھا' بوجھل تر دل لے کر واپس آ گیا۔

دو دن اس نے بے حد پریشانی کے عالم میں گزارے۔ تیسرے دن وہ پھر وہاں پہنچا۔ آج معاملہ پہلے سے بھی حوصلہ شکن تھا۔ رانو نے اسے دیکھا اور دیکھتے ہی اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ اشرف نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بار۔ دو بار.......... پھر اس نے لرزتی آواز میں رانو کو پکارا۔ دوسری تیسری آواز پر رانو نے اندر سے کہا۔ "اشرف! تم چلے جاؤ۔ میں تم سے ملنا نہیں چاہتی۔"

اشرف کا حلق خشک ہو گیا۔ وہ تھوک نگل کر بولا۔ "مگر تم نے تو کہا تھا کہ پرسوں تمہیں بتاؤں گی۔ ایسا مت کرو۔ دروازہ کھولو' میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

رانو خاموش رہی لیکن جب اشرف کا اصرار بڑھ گیا تو اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی آنکھیں روئی روئی تھیں۔ آج وہ لان کی بڑی خوب صورت گلابی شلوار قمیض میں تھی۔ قمیض کے گریبان میں سے اس کی ہنسلی کی ہڈیاں بہت نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ آج شاید اس نے شیمپو بھی کر رکھا تھا کیونکہ اس کے روکھے پھیکے بالوں میں چمک تھی۔ وہ اپنی پتلی کلائیوں میں چوڑیوں کو گھماتی رہی اور اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں لہراتی رہیں۔

پرسوں کی طرح آج بھی رانو نے دل کی بات بتانے میں پس و پیش کیا مگر جب اشرف نے زیادہ اصرار کیا تو وہ ایک گہری سانس لے کر یوں گویا ہوئی۔ "آج سے چند سال پہلے میرا بھائی ہیروئن پینے لگا تھا اور سخت بیمار ہو گیا تھا۔ اس کے علاج معالجے کے لئے میں نے مرجان نامی ایک شخص سے قرضہ لیا۔ یہ قرضہ بڑھتے بڑھتے بیس ہزار روپے ہو گیا۔ اب کئی مہینوں سے مرجان خاں نامی یہ شخص مجھے تنگ کر رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں اس کی رقم واپس کروں۔ وہ نشہ کر کے وقت بے وقت یہاں گھس آتا تھا۔ کئی کئی گھنٹے یہاں رہتا تھا اور گالیاں وغیرہ بھی دیتا تھا۔ دو تین ہفتے پہلے وہ ایک واقف تھانے دار کو یہاں لے آیا۔ پولیس والے مجھے تھانے لے گئے اور بری طرح ڈرایا دھمکایا۔ وہاں طے ہوا کہ میں اگلے مہینے کی پچیس تاریخ تک پندرہ ہزار روپیہ مرجان کو دوں گی یا پھر اس کے ساتھ جہاں وہ چاہے گا چلی جاؤں گی۔ اب میعاد ختم ہونے میں آٹھ دس دن رہ گئے ہیں اور میں کچھ بھی نہیں کر سکی۔ مشکل سے دو ہزار اکٹھا کیا تھا۔ اس میں سے پرسوں ایک ہزار پولیس والا لے گیا کیونکہ میں پچھلے مہینے بھی اسے "ماہوار" نہیں دے سکی تھی۔ اب صرف ایک ہزار روپیہ میرے پاس ہے۔ مرجان خاں یہاں آیا تھا۔ اس نے مجھے بتا دیا ہے کہ وہ مجھے اپنے ساتھ راولپنڈی لے جانا چاہتا ہے۔ اب پچیس چھبیس تاریخ تک میں یہاں سے جا رہی ہوں۔"

دل اشرف کے سینے میں زخمی کبوتر کی طرح پھڑک گیا۔ وہ رانو کا شانہ تھام کر بولا۔

"نہیں۔ میں تم کو نہیں جانے دوں گا۔"

"چھوٹے بالم! کیا کرو گے تم؟ مرجان خاں بڑا سخت بندہ ہے۔"

اشرف کچھ دیر سوچتا رہا' پھر بولا۔ "میں تمہیں پیسے لا کر دوں گا۔ تم یہ پیسے اس خبیث کے منہ پر مارنا۔"

"تم کہاں سے لاؤ گے پیسے؟"

"یہ میرا مسئلہ ہے۔ بس میں تمہیں بتا دوں۔ تمہیں یہاں سے جانا نہیں ہے۔"

اگلے روز اشرف نے امی جان کی لوہے کی الماری میں سے سونے کے دو بندے اور دو انگوٹھیاں نکال لیں۔ یہ چیزیں امی نے دو تین مہینے پہلے آپا عارفہ کے لئے بنوا کر رکھی تھیں۔

اشرف کے دوستوں میں طوطا سب سے بڑا تھا۔ اتفاقاً سوہے بازار میں طوطے کا ایک دوست زیورات کی دھلائی اور پالش کا کام کرتا تھا۔ اشرف نے طوطے کو اپنا رازدار بنایا اور اس کی مدد سے بندے اور انگوٹھیاں بیچ کر تیرہ ہزار روپے حاصل کر لئے۔ ایک ہزار روپیہ طوطے نے اسے اپنے استاد جیدے سے ادھار لے دیا' یوں اس کے پاس چودہ ہزار روپیہ ہو گیا۔ اشرف نے طوطے کو رانو وغیرہ کے بارے میں اس شرط کے ساتھ بتا دیا تھا کہ وہ کبھی کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کرے گا۔ طوطے نے فلمی انداز میں اشرف کا کندھا تھامتے ہوئے کہا تھا۔ "اوئے! ہم بجنوں کے سجن ہیں۔ میں جان دے سکتا ہوں لیکن اپنے یار کے خلاف زبان نہیں کھول سکتا۔"

اسی دن اشرف رقم جیب میں ڈال کر رانو کے پاس پہنچا۔ اس نے روپے رانو کے سامنے رکھے تو اس نے خوشی سے بے قابو ہو کر اشرف کو چوم لیا۔ آج رانو نے دل کھول کر پرفیوم لگایا ہوا تھا۔ کمرے کی سیلن زدہ باس قدرے دبی ہوئی تھی۔ رانو کے کپڑے بھی اچھے تھے۔ رانو نے تھوڑا سا پھل کاٹ کر اشرف کے سامنے رکھا اور ٹھنڈے دودھ کا گلاس بھی لے آئی۔

"اتنے روپے کہاں سے لے آئے چھوٹے بالم؟"

"بس لے آیا اس بات کو چھوڑو۔"

"کتنے ہیں؟"

"چودہ ہزار۔ تم ہزار اپنے پاس سے ڈال کر پورے پندرہ کر لو اور اس کمینے کے منہ پر مارو۔"

"ہائے چھوٹے بالم! تم نے تو میرا کلیجہ ہی نکال لیا ہے۔ میرے بس میں ہو تو اپنی

کھال اتار کر تیرے قدموں میں بچھا دوں۔" اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ بجلی کے سوئچ کی طرف بڑھ گیا۔ کمرا نیم تاریکی میں ڈوب گیا۔ گرم سانسوں کی سرگوشی اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ تیز پرفیوم نے اس کی حسِ شامہ کو ڈھانپ لیا۔ وہ آج بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اشرف سے لپٹتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی ہنسلی کی ہڈیاں بہت نمایاں تھیں' بلکہ سارے جسم کی ہڈیاں ہی نمایاں تھیں' پھر بھی اس کے جسم میں کشش تھی۔

ایک گھنٹے بعد اشرف' رانو سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ اس نے پرسوں پھر آنے کا کہا تھا۔

لیکن اس کے بعد وہ رانو کو کبھی نہیں دیکھ سکا۔ وہ اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گئی تھی۔ بہرحال اس بات کا پتا اشرف کو دو دن بعد لگا۔

گھر آ کر بھی اشرف مسرور ہی رہا۔ اس نے امی کی الماری میں جو نقب لگائی تھی وہ ابھی تک راز تھی اور اشرف کو امید تھی کہ کافی دنوں تک راز ہی رہے گی۔ امی الماری کا وہ خانہ بہت کم کھولتی تھیں۔ اگلا دن اشرف نے بڑی مصیبت سے کاٹا' تیسرے روز اتوار تھا۔ اس نے پہلے "بارہ سے تین" فلم کا پہلا شو دیکھا' پھر تانگے کی سیر کرتا رانو کی طرف روانہ ہو گیا۔ "اس بازار" میں داخل ہو کر وہ ارد گرد کم ہی دیکھتا تھا' سیدھا رانو کے دروازے پر جا کر رکتا تھا۔ آج بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ دروازے پر ایک تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اِدھر اُدھر گھومتا رہا پھر ایک میلے کچیلے ہوٹل میں جا بیٹھا اور ڈش دیکھتا رہا۔ ایک ایک گھنٹے کے وقفے سے اس نے رانو کی کوٹھڑی کے دو چکر لگائے لیکن تالا بدستور موجود تھا۔ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ مختلف چوباروں سے گانے بجانے کی آوازیں آنے لگی تھیں' وہ مایوس ہو کر واپس چلا آیا۔

اگلے روز وہ پھر رانو کے دروازے پر پہنچا۔ آج بھی اس کا استقبال رانو کے بجائے تالے نے ہی کیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے واپس جا کر اس بات کا ذکر طوطے سے بھی کیا۔ طوطا یوں تو بہت گھاگ تھا مگر بازارِ حسن کے معاملات کے متعلق اسے بھی کچھ زیادہ پتا نہیں تھا۔ اشرف نے تین دن اسی طرح بازارِ حسن کے چکر لگائے۔ چوتھے دن وہ وہاں پہنچا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دروازے کی بیرونی سیڑھیوں پر ایک بھرے بھرے جسم کی عورت بناؤ سنگھار کئے بیٹھی تھی۔ اس کے ہونٹ پان سے رنگے ہوئے تھے۔

اشرف کو دروازے کے سامنے کھڑے دیکھ کر اس نے پہلے تو اشرف کو آنکھ ماری لیکن جب دیکھا کہ اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں ابھرا تو بولی۔ ''کیا بات ہے لونڈے۔ کیا دیکھ رہا ہے؟''

''وہ.......... وہ یہاں۔ پہلے..........'' وہ ہکلایا۔

''اچھا تو تُو اس پہلے والی کا عاشق ہے۔ بچہ جی' وہ تو یہاں سے پُھر ہو گئی' یعنی اڑ گئی۔ اب تو اس کی جگہ میں ہوں۔ کہو کیا خدمت کروں؟''

''کہاں گئی وہ؟''

''بس دفع ہو گئی حرام زادی۔ پتا نہیں کہاں گئی۔''

''کیا کسی سے جھگڑا ہوا تھا' اس کا؟'' اشرف نے ہمت کر کے پوچھا۔

''کوئی ایک جھگڑا تھا۔ بندے بندے کا تو ادھار دینا تھا حرام زادی نے۔ بڑی ٹھگ باز تھی۔ کہیں تیرے ساتھ تو کوئی ہینگی بینگی نہیں کی۔''

''نن۔ نہیں تو۔''

''چل پھر جا کر دربار پر تیل ڈال۔ تیرے جیسے بجونگڑے کو تو اس نے ضرور تھوک لگا دینا تھا۔''

اشرف کے کان شائیں شائیں کر رہے تھے۔ اس بھدی عورت کی کسی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ رانو ایسی نہیں تھی۔ وہ تو اس سے بڑی محبت کرتی تھی۔ وہ ضرور یہیں کہیں ہو گی۔ شاید اس نے اپنا ٹھکانا بدل لیا ہو۔ کسی وجہ سے اچانک اسے کوئی دوسری کوٹھری ڈھونڈنی پڑ گئی ہو۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگایا اور لڑکھڑاتے قدموں سے ان سیلن زدہ گلیوں میں رانو کو ڈھونڈنے لگا۔

☆==========☆==========☆

پورا ایک ہفتہ اشرف اسی طرح رانو کی تلاش میں سرگرداں رہا پھر پھولوں کے ہار بیچنے والے ایک شخص سے اسے مرجان کا پتا بھی چل گیا۔ وہ اس مرجان نامی شخص کے پاس پہنچا۔ وہ بازار کی ایک ذیلی سڑک پر سری پائے بیچتا تھا اور دیگی چرغہ بناتا تھا۔ ہار بیچنے والے نے مرجان نامی اس شخص کو اشرف کا مسئلہ بتایا۔

مرجان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری' اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''کتنے کا ٹیکا لگایا ہے اس کتیا نے تجھے؟''

''نن.......... نو ہزار۔'' اشرف نے اسے پانچ ہزار کم کر کے بتائے۔ شاید وہ اس طرح اپنی شخصیت میں بے وقوفی کا ''لیول'' ذرا نیچے لانا چاہتا تھا۔

''تیرا ایک بھائی بند اور بھی یہاں موجود ہے۔'' مرجان نے سالن میں چمچہ گھماتے ہوئے کہا' پھر وہ اپنے نو عمر ملازم سے بولا۔ ''اوئے چھیدے! جا اس لمڈے رنگ الٰہی کو بلا کر لا۔''

دو منٹ بعد لمبے قد کا ایک دیہاتی لڑکا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ شکل و صورت سے کسی کاشت کار یا زمیں دار کا باغی بیٹا نظر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر مرجان نے کہا۔ ''اوئے لمڈے! دیکھ تیرے ساتھ کا ایک اور شکار آیا ہے' اسے اپنی کہانی سنا۔''

وہیں لکڑی کی بینچوں پر بیٹھ کر اس دیہاتی لڑکے نے جو کچھ اشرف کو بتایا' اس نے اشرف کے چودہ طبق روشن کر دیئے۔ لڑکے کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ بھی رانو کے پاس جاتا تھا۔ رانو نے اس لڑکے کے ساتھ بھی وہی اشرف والا ڈراما کیا تھا۔ اسی طرح پہلے اس سے ملنے سے انکار کیا تھا' پھر اسے مرجان خاں والی بپتا سنائی تھی اور آخر میں اس سے چھ سات ہزار روپے اینٹھے تھے۔

اشرف کی آنکھوں میں ضبط کے باوجود آنسو تیر گئے۔ اس نے پورے چودہ ہزار روپے کا دھوکا کھایا تھا اور یہ چودہ ہزار روپے اس نے جس طرح اکٹھے کئے تھے' کچھ وہی جانتا تھا۔ اس نے اپنی آپا کے زیور بیچے تھے۔ اپنی نہایت پیار کرنے والی ماں اور آپا کو سنگین دھوکا دیا تھا۔ یہ دکھ اپنی جگہ حقیقت تھے اور اس کے ساتھ رانو کی دغا بازی اور جدائی کا دکھ بھی حقیقت تھا۔ ایک دم اسے یوں لگا تھا جیسے وہ ایک تیز سیلابی پانی میں ہو اور اس کی کشتی کے دونوں چپوار ٹوٹ گئے ہوں۔ آنسوؤں کی نمی نے اس کی آنکھوں کے سامنے پانی کی چادر سی تان دی تھی۔ اسے لگا جیسے اس دنیا میں کوئی ایسا نہیں جو اسے پیار دے سکے' اس کے اندر کی اتھل پتھل کو سمجھ سکے۔ سب نے اسے دھکے ہی دیئے تھے۔ تارا' نشاط' رانو۔ سب نے اسے دھتکارا تھا اور اس کی اس بے عزتی کا سبب کون تھا۔ شاید ارمان۔ وہ اس کے سراپا میں ایک ایسی حرارت جگا گئی تھی جس نے اسے وقت سے پہلے ہی چٹخا کر جوان کر دیا تھا۔ اب وہ بچے کی حیثیت سے شفقت کا مستحق تھا نہ بالغ کی حیثیت سے محبت کا۔ بے وقت کی آگہی نے اسے ہر رعایت سے محروم کر دیا تھا۔

ابھی وہ بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک دو پولیس موبائلز تیزی سے وہاں آ کر رکیں'

اس کے ساتھ ہی ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ جھروکے اور دروازے بند ہو گئے۔ گلی میں مٹر گشت کرنے والے تماش بینوں کے جدھر سینگ سمائے بھاگ نکلے۔ "اوئے بھاگ جاؤ۔ چھاپا پڑ گیا ہے۔" مرجان خاں نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر چیختے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اٹھ کر بھاگے۔ رنگ الٰہی نامی نوجوان تو چند گز آگے جا کر ہی پکڑا گیا۔ اشرف تیزی سے دوڑ کر ایک دروازے میں گھس گیا لیکن ابھی وہ دروازے کو اندر سے کنڈی نہیں چڑھا پایا تھا کہ دو پولیس والے دھکا دیتے ہوئے اندر گھس آئے۔ بید کی چھڑی کی چند زور دار ضربیں اشرف کی ٹانگوں اور کمر پر لگیں۔ ایک ہٹے کٹے پولیس والے نے اسے بالوں سے پکڑا اور بے دردی سے کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ دوسرا پولیس والا گالیاں دے رہا تھا اور اشرف کے کولہوں پر چھڑی سے ضربیں لگا رہا تھا۔ اسے قربانی کے جانور کی طرح گھسیٹ کر پولیس موبائل میں پھینک دیا گیا۔ دوسری موبائل میں کسبی طوائفوں کو بھرا جا رہا تھا۔ ان میں سے کئی ایک پولیس والوں کی منتیں کر رہی تھیں، پولیس والے انہیں گندی گالیاں دے رہے تھے۔

☆=========☆=========☆

طوائفوں کے محلے سے اشرف کے پکڑے جانے کی خبر تارا پر بجلی بن کر گری تھی۔ وہ ساری رات روتی رہی تھی۔ اس نے تو ہر نماز کے بعد اشرف کی بہتری اور اس کے سدھار کے لئے دعائیں مانگی تھیں۔ اس کی دعاؤں کے اثر کو کیا ہو گیا تھا۔ تارا کے گھرانے اور پھپھو کے گھرانے کے سوا اشرف کے پکڑے جانے کی خبر کسی کو نہیں تھی۔

اشرف کی امی اور آپا نے بھی رو رو کر برا حال کر رکھا تھا۔ دوسری طرف اشرف کے ابا جان نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اشرف کی ضمانت کرانے تھانے نہیں جائیں گے اور نہ کسی اور کو جانے دیں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس بدبخت کو اس کے کئے کی قرار واقعی سزا ملنی چاہئے۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ پولیس والوں کی مار کھا کر اشرف نے اس چوری کے بارے میں بھی بتا دیا تھا جو اس نے چند روز پہلے گھر میں کی تھی۔ اس نے اپنی آپا کے بندے اور انگوٹھیاں سوہا بازار میں بیچی تھیں اور چودہ ہزار روپے ایک طوائف کی نذر کر دیئے تھے۔ تارا کے گھر میں کسی کو یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ چودہ پندرہ سال کا اشرف اتنے "بڑے بڑے" کام کر رہا ہے۔

ایک دن اشرف کی امی یعنی تارا کی پھپھو ان کے گھر آئیں۔ انہوں نے اپنے بھائی

کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "ارشاد! تم ہی کچھ کرو۔ اس بدنصیب کو تھانے سے چھڑا لاؤ۔ عارفہ کے ابا نے تو قسم کھائی ہے کہ وہ دو سال بھی وہاں سڑتا رہے تو اس کی خبر نہیں لیں گے۔"

تارا کے ابو نے بہن کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "بڑی آپا! آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں۔ میں نے اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اللہ نے چاہا تو پرسوں تک اشرف گھر آجائے گا۔"

"تم اسے تھانے میں مل کر آئے ہو؟"

"ہاں وہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"مجھے پتا ہے تم مجھے تسلیاں دے رہے ہو۔ انہوں نے اسے بہت مارا ہو گا۔ انہوں نے مارا ہے تو اس نے چوری بتائی ہے نا۔"

"بڑی آپا! وہ کوئی پکا چور تھوڑی تھا۔ انہوں نے دو چار تھپڑ مارے اس نے بک دیا۔ میں اسے خود دیکھ کر آیا ہوں، وہ بالکل ٹھیک ہے لیکن............"

"لیکن کیا؟" اشرف کی امی نے بے قرار ہو کر کہا۔

"اشرف پرسوں تک انشاء اللہ گھر تو آجائے گا، مگر اس کے بعد معاملہ سنبھالنا آپ کا کام ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ بھائی جان (اشرف کے والد) اس سے سختی سے پیش آئیں گے۔ یہ نہ ہو کہ وہ گھر سے ہی بھاگ جائے۔"

"میں سب سنبھال لوں گی۔ بس میرے ویر! ایک بار تم اسے گھر لے آؤ۔" اشرف کی امی نے روتے ہوئے کہا۔

"ویسے تو میرا دل چاہ رہا تھا کہ کچھ دن کے لئے اسے اپنے گھر ہی لے آؤں مگر پھر بھائی جان کی ناراضگی کا خیال آجاتا ہے۔" تارا کے ابو نے کہا۔

"نہیں۔ نہیں ابھی اسے گھر ہی آنے دو، پھر دیکھ لیں گے۔"

جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں، تارا کے ہونٹ مسلسل دعائیہ انداز میں ہل رہے تھے۔

☆=========☆=========☆

پانچویں دن عدالت سے اشرف کی ضمانت ہو گئی۔ پولیس والوں نے اسے ٹھیک ٹھاک مار لگائی تھی، اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اب ایک نیا امتحان اس کے سامنے تھا۔

اسے گھر والوں کا اور خاص طور سے ابا جان کا سامنا کرنا تھا۔ ماموں جان نے سارے راستے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ ان کی ہمیشہ مہربان نظر آنے والی آنکھوں میں دکھ اور غصے کی جھلک اتنی نمایاں تھی کہ وہ دوبارہ ان کی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکا۔ راستے میں انہوں نے بس ایک فقرہ کہا تھا۔ ”اشرف! تم نے ہم سب کے سر شرم سے جھکا دیے ہیں۔“

کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اشرف کو لے کر اس کے ابا جان کے سامنے جاتا‘ مگر ماموں نے یہ ہمت بھی کی۔ اس سے پہلے بھی کئی موقعوں پر ابا جان کے تھپڑ جو اشرف کے گالوں پر پڑنے تھے ماموں نے اپنے ہاتھوں اور بازوؤں پر کھائے تھے۔ غالباً آج بھی وہ اس قسم کی صورتِ حال کے لئے تیار تھے.......... مگر غیر متوقع طور پر ایسی صورت حال پیش نہیں آئی۔ ابا جان کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ تھا مگر انہوں نے ضبط سے کام لیا‘ اور ماموں جان سے ”ضمانت“ کے بارے میں چند ایک سوال پوچھ کر نماز پڑھنے مسجد میں چلے گئے۔

ماموں جان بھی کچھ دیر ان کے گھر ٹھہر کر اپنے گھر چلے گئے۔ ان کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد اشرف کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ابا جان گھر واپس آئے اور انہوں نے کمرے میں بند کر کے اشرف پر تھپڑوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ اشرف کے ناک منہ سے خون بہنے لگا۔ ابا جان نے دھاڑتے ہوئے اشرف کو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ وہ اسے کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے بیرونی دروازے پر لے آئے۔ اسے چھڑانے کی کوشش میں آپا عارفہ کی ساری چوڑیاں ٹوٹ گئیں اور وہ گر پڑیں۔ اشرف کی امی اپنے کمرے میں ہی بے ہوش ہو گئی تھیں۔ جب ابا جان نے شدید غم وغصے کے عالم میں اشرف کو گھر کی دہلیز سے باہر دھکا دیا‘ عین اس وقت اشرف کے سینے میں بغاوت کی ننھی سی چنگاری چمکی۔ اس نے سوچا‘ ٹھیک ہے اگر گھر والے اسے گھر میں رکھنا نہیں چاہتے تو وہ گھر میں نہیں رہے گا۔ ہاں.......... وہ نہیں رہے گا گھر میں۔

گھر بدر ہونے کے بعد اشرف سیدھا طوطے کے گھر پہنچا تھا۔ اس نے طوطے سے کچھ روپے ادھار لئے اور ملتان چلا گیا۔ ملتان میں وہ کوئی دس دن رہا‘ جب پیسے ختم ہونے لگے تو اسے واپس لاہور آنا پڑا۔ لاہور آ کر وہ گھر نہیں گیا بلکہ سیدھا طوطے کے پاس پہنچا۔ طوطے نے اسے بتایا کہ وہ اس کی رہائش کا انتظام ورکشاپ میں کر چکا ہے۔ وہ استاد جیدے کے ساتھ ورکشاپ میں رہ سکتا ہے اور اگر چاہے تو اپنے جیب خرچ کے لئے

ورکشاپ میں تھوڑا بہت کام بھی کر سکتا ہے۔

اشرف ورکشاپ میں استاد جیدے کے پاس چلا گیا۔ وہاں اس نے اخبار دیکھا تو پتا چلا کہ یہ مارچ کی دس تاریخ ہے۔ اس کو جھٹکا سا لگا۔ اسکول میں نویں کلاس کے امتحان شروع ہوئے پانچ روز ہو چکے تھے۔ اسکول میں اس کے ساتھ پڑھنے والے لڑکے یقیناً صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس امتحان دے رہے تھے مگر وہ امتحانات اور اسکول وغیرہ سے بہت دور جا چکا تھا۔ خستہ حال کپڑے پہنے وہ ایک ورکشاپ کے اندر بیٹھا تھا پھر اس نے سوچا‘ چلو اچھا ہی ہوا کہ وہ امتحان دینے والے لڑکوں میں شامل نہیں۔ اس امتحان کا نتیجہ‘ بری طرح فیل ہونے کے سوا اور کچھ نہیں نکلنا تھا۔ غم غلط کرنے کے لئے اس نے استاد جیدے کا ٹی وی آن کیا اور ایک سستے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔ ہر کش کے ساتھ اس کو اپنے سینے میں آگ سی اترتی محسوس ہوتی تھی۔

ایک روز ایک چادر پوش عورت ورکشاپ پہنچی۔ اشرف اس وقت ملیشیا کے کپڑے پہنے ایک خراب گاڑی کے نیچے گھسا ہوا تھا۔ چادر پوش عورت اشرف کی امی تھیں۔ انہوں نے اشرف کو سینے سے لگا لیا اور دیر تک زارو قطار روتی رہیں۔ پھر اس نے کہا۔ ”اشرف! چل میرے ساتھ گھر چل۔ اپنے ابا جان کے پاؤں پکڑ لے۔ وہ تیرے باپ ہیں۔ وہ تجھے معاف کر دیں گے۔“

اس سے پہلے ایسی باتوں کے جواب میں وہ سر جھکائے خاموش کھڑا رہتا تھا‘ لیکن اب حوالاتیوں میں چند دن گزار کر اور ملتان کی سیر کر کے اس کے اندر تھوڑی سی سرکشی پیدا ہو گئی تھی۔ اب وہ ناپسندیدہ بات کا جواب دے سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ ”نہیں امی! میں گھر نہیں جاؤں گا۔ ابا جان کو میری شکل ہی اچھی نہیں لگتی‘ میں گیا تو وہ پھر مار پیٹ کر گھر سے نکال دیں گے۔“

اشرف کی امی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ شاید انہیں توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح جواب دے گا۔ انہوں نے روہانسی آواز میں کہا۔ ”اشرف! تو تو ایسا نہیں تھا۔ یہ کیا ہو گیا ہے تجھے؟“

وہ عجیب لہجے میں بولا۔ ”امی! مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ یہاں میں بہت خوش ہوں۔ بس آپ کا دل چاہے تو کبھی یہاں آ کر مجھے مل لیا کریں۔“

”بکواس بند کر۔ میں تجھے ساتھ لے کر جاؤں گی۔“

"اگر آپ زیادہ سختی کریں گی تو پھر میں یہاں سے بھی چلا جاؤں گا پھر آپ ڈھونڈتی رہیں گی مجھے۔" اس کا لہجہ ایسا تھا کہ اس کی امی سکتے کی سی حالت میں رہ گئی تھیں۔ اشرف نے مزید کہا۔ "اور ماموں جان کو بھی سمجھا دیں کہ وہ یہاں نہ آئیں۔ وہ مجبور کر کے لے بھی جائیں گے تو میں گھر میں رہوں گا نہیں۔"

امی روتی ہوئی واپس چلی گئی تھیں۔ اشرف کو اندیشہ تھا کہ اور کوئی آئے نہ آئے مگر ماموں اس کے پیچھے ضرور آئیں گے مگر آٹھ دس دن گزر گئے' اس کا اندیشہ سچ ثابت نہیں ہوا' ایک دن جہانگیر ورکشاپ میں آیا' اس کی زبانی اشرف کو پتا چلا کہ ماموں تو اسپتال میں ہیں۔ ان کے اسکوٹر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور ان کے سینے میں چوٹ آئی ہے۔

اشرف کو افسوس تو بہت ہوا مگر اس کے ساتھ یہ تسلی بھی ہوئی کہ اب ماموں اس کے پیچھے یہاں ورکشاپ میں نہیں آئیں گے۔

ورکشاپ میں اشرف کے دن مزے سے گزرنے لگے۔ استاد جیدے کے پاس اس کی حیثیت شاگرد کاریگر کی تھی۔ جیدا شام کو بیس پچیس روپے اس کی جیب میں ڈال دیتا تھا۔ یہ پیسے سگریٹ اور دو وقت کے کھانے کے لئے کافی تھے۔ دوپہر کا کھانا استاد کے ذمے تھا۔ اکثر وہ رات کے کھانے میں بھی استاد کے ساتھ شریک ہو جاتا تھا۔ دو ہفتے پہلے استاد نے ایک اور ڈش لگائی تھی۔ یہ ڈش تھائی لینڈ' چین' روس اور پتا نہیں کون کون سے ملک پکڑتی تھی۔ تین ڈشوں کے ملا کر دو سو سے زیادہ چینل بن جاتے تھے۔ ان میں ایسے ایسے چینل بھی تھے کہ بندہ دیکھے تو نیند اڑ جائے۔ ہیرا منڈی کی جسم فروش عورت رانو' اشرف کی زندگی سے دفع ہو چکی تھی لیکن وہ اب بھی کسی وقت اسے یاد آجاتی تھی۔ اس کے کچے ذہن پر اس کے غلیظ قدموں نے گہرے نشان چھوڑے تھے۔ ایک رات جب وہ ایسے ہی گم صم بیٹھا تھا' استاد جیدے نے اسے اپنے پاس بلایا۔

"چھوٹے! ذرا ٹانگیں دبا میری۔" استاد نے نشیلے لہجے میں کہا۔

وہ ٹانگیں دبانے لگا۔ استاد جیدے نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "اوئے! گم صم کیوں ہے۔ کہیں وہ "بڑے بازار" کی فراڈن تو یاد نہیں آرہی؟"

طوطا استاد کے سر کی مالش کر رہا تھا۔ بولا "یہ تو نہیں مانے گا' لیکن بات یہی ہے استاد۔ وہ اس کو ناکام ہیرو بنا گئی ہے۔ پہلے دن میں چار پانچ سگریٹ پیتا تھا اب پوری دو

ڈبیاں پینے لگا ہے۔"

استاد جیدے نے کہا۔ "پاگلو! سگریٹ سے غم ہلکا تو ہو جاتا ہو گا لیکن بھاگتا نہیں ہے۔ غم کو بھگانا ہو تو پھر یہ پیئو۔"

اس نے پلنگ کے نیچے ہاتھ ڈال کر انڈین شراب کی کوارٹر بوتل نکال لی۔

وہ پہلا دن تھا جب اشرف نے استاد جیدے کے اصرار پر ام الخبائث کو پہلی بار منہ سے لگایا۔ پندرہ سال کی عمر میں پہلا گھونٹ اس کے اندر گیا۔ نازک سا تو اندر تھا' جیسے کسی نے چیر کر رکھ دیا۔ وہ کتنی دیر کھانستا رہا۔ استاد جیدا اور طوطا ہنستے رہے۔ طوطا خود بھی کبھی کبھار ایک دو گھونٹ لگا لیتا تھا۔ اسے خوشی ہوئی کہ اشرف بھی اس کے ساتھ شریک ہو گیا ہے۔

دن گزرتے رہے۔ اشرف کی امی وقتاً فوقتاً آتی رہیں۔ وہ اسپتال سے ماموں ارشاد کے دو تین پیغام بھی لے کر آئیں۔ ماموں نے اس سے کہا تھا کہ وہ اسپتال میں آکر ان سے ملے۔ اشرف ہر مرتبہ ماں سے وعدہ کرتا رہا مگر گیا ایک بار بھی نہیں۔ اس کی زندگی کا رخ مکمل طور پر بدل چکا تھا۔ اس کا قد اب ساڑھے پانچ فٹ کے قریب ہو گیا تھا۔ بالائی ہونٹ پر سیاہی مائل مونچھیں نظر آنے لگی تھیں۔ اس کے ارد گرد لچر فلموں اور لوفر دوستوں کی بھرمار تھی۔ پہلے گھر والوں کی فکر تھی' اب وہ بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ وہ راتوں کو آوارہ گردی کرتا اور کبھی کبھی طوطے کے ساتھ بازار حسن بھی جا پہنچتا۔ رانو اب وہاں نہیں تھی لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اشرف کو معلوم ہو گیا تھا کہ جیب میں پیسے ہوں تو اس بازار سے ہر قسم کا مال خریدا جا سکتا ہے۔ چھوٹی سی عمر میں ہی اسے خرید و فروخت کے سارے داؤ پیچ آگئے تھے بلکہ اس معاملے میں تو طوطے جیسے گھاگ نے بھی اسے اپنا استاد مان لیا تھا۔ ایک دن وہ دونوں بازارِ حسن کی ایک گلی میں گشتی پولیس کے ہتھے چڑھتے چڑھتے بھی بچے لیکن اس قسم کے واقعات اب اشرف پر زیادہ اثر نہیں کرتے تھے۔

وہ ہفتے کی ایک نسبتاً گرم شام تھی۔ اشرف اور طوطے کو ہفتہ وار پیسے ملے تھے۔ انہوں نے اُس بازار میں جانے کی ٹھانی جہاں کھڑکیوں اور جھروکوں میں عورت بکتی ہے۔ وہ دونوں جیل روڈ سے خراماں خراماں مزنگ چونگی کی طرف چلے جا رہے تھے' ایک جگہ انہیں ایک صاحب نظر آئے' انہوں نے گاڑی کا بونٹ اٹھا رکھا تھا اور سیلف پر سیلف

مارے جا رہے تھے۔ طوطے کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی' بولا۔ "چل آ' صاحب کو گاڑی اسٹارٹ کر دیں۔ بیس تیس روپے کا جیک لگ جائے گا۔"

وہ دونوں پسینہ پسینہ صاحب کے پاس پہنچے۔ طوطے نے اسے بتایا کہ وہ موٹر مکینک ہے۔ پریشان حال صاحب نے فوراً گاڑی کی چابی طوطے کی طرف بڑھا دی۔ طوطے نے سیلف مار کر دیکھا پھر ماہرانہ انداز میں انجن سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ آدھا گھنٹا لگ گیا۔ گاڑی نے اسٹارٹ تو کیا ہونا تھا۔ اس کی فیول لائن بھی کہیں سے "لیک" کر گئی اور پٹرول ٹپکنے لگا۔ اب طوطے کو پسینے آرہے تھے اور صاحب جھلایا ہوا تھا۔ طوطے نے بمشکل پٹرول کا اخراج روکا اور اشرف کو گاڑی کے نیچے گھس کر دو نٹ کسنے کا حکم دیا۔

اشرف نٹ کسنے کے لئے نیچے گھسا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ ایک پرائیویٹ اسپتال کا گیٹ بالکل سامنے ہی نظر آرہا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ ایک منظر پر پڑی اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے ماموں ارشاد کو دیکھا۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ اسپتال سے باہر آرہے تھے۔ ایک طرف سے ممانی اور دوسری طرف سے تارا نے انہیں سہارا دے رکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے تھے۔ ان کے عقب میں اشرف کے ابا جان تھے۔ ساتھ ہی آپا تھیں جنہوں نے ٹوکریاں وغیرہ اٹھا رکھی تھیں۔ کچھ سامان چچا رشید نے اٹھایا ہوا تھا۔ اشرف کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ماموں ارشاد اس اسپتال میں زیر علاج تھے اور اب فارغ ہو کر گھر جا رہے ہیں۔

وہ گاڑی کے نیچے کچھ اور بھی دبک گیا۔ اس کی نگاہ تارا پر پڑی۔ آدھے بازو کی پھولدار قمیص میں وہ دلکش نظر آرہی تھی۔ اس نے خوب رنگ روپ نکالا تھا........... وہ چلتے ہوئے اشرف کے ابا جان سے کوئی بات بھی کر رہی تھی۔ اس کی مدھم میٹھی آواز اشرف کے کانوں تک پہنچی مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔ اشرف سے صرف چند قدم کی دوری پر وہ لوگ ٹھہر گئے اور اپنا سامان کار میں رکھنے لگے۔ اشرف نٹ کسنے کے لئے نیچے گھسا تھا اور چابی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ باہر "صاحب" سخت جھلایا ہوا تھا۔ اس نے اشرف کو باقاعدہ گالی دیتے ہوئے کہا۔ "اب وہاں نیچے کس ماں کی فاتحہ پڑھنے لگ گئے ہو؟"

"بس صاحب جی! ایک نٹ رہ گیا ہے۔" اشرف نے مری مری آواز میں کہا۔

دراصل وہ اس انتظار میں تھا کہ اس کے گھر والے وہاں سے جائیں اور وہ باہر

نکلے۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ طے ہوا اور اشرف پسینے پونچھتا ہوا باہر نکل آیا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل ایک دم بہت اداس اور بیزار ہو گیا تھا۔ اس کو اپنے اردگرد کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے طوطے کے ساتھ بازار حسن جانے کا ارادہ بھی ملتوی کر دیا۔ وہیں مزنگ چونگی سے نان تکے کھا کر وہ لوگ ورکشاپ واپس آگئے۔

اس رات طوطے کے منع کرنے کے باوجود اشرف نے "کم قیمت" دیسی شراب کی آدھی کپی چڑھا لی اور مدہوش ہو کر واہی تباہی بولتا رہا۔ نشے میں اسے کمرے کی دیواریں سرخ نظر آرہی تھیں۔ یہ وہی رنگ تھا جو تارا کی آدھی آستینوں والی قمیض کا تھا۔ اس قمیض پر خوبصورت سفید پھول تھے۔ تارا کی آواز اس کے کانوں میں گونجتی رہی۔ "اشرف! تم کتنی گہرائی میں گر گئے۔ تم نے مجھے کھو دیا اشرف........... تم نے کھو دیا۔"

پتا نہیں کیوں اس رات تارا اسے بڑی شدت سے یاد آئی۔ شاید جو چیز انسان کی پہنچ سے بہت دور ہوتی ہے' وہی اسے مطلوب ہوتی ہے۔ وہ اس فاصلے کو ناپتا رہا جو اس کے اور تارا کے درمیان پیدا ہو چکا تھا' اس کا دل روتا رہا۔

صبح وہ اٹھا تو تیز بخار تھا۔ رات کو کھانسی بھی معمول سے زیادہ ہوئی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ آج سارا دن بستر پر پڑا اینٹھتا رہتا لیکن آج تو اسے سفر پر روانہ ہونا تھا........... ایک لمبے سفر پر۔ وہ جانتا تھا کہ ماموں اسپتال سے گھر آچکے ہیں اور چلنے پھرنے کے قابل ہیں۔ اب انہوں نے یقیناً یہاں پہنچ جانا تھا۔ انہوں نے اشرف کو گھر چلنے کا حکم دینا تھا۔ اشرف نے کبھی ان کی بات نہیں ٹالی تھی' آج بھی ٹالنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بڑی خاموشی کے ساتھ لاہور چھوڑ رہا تھا۔ اس کی منزل ملتان تھی۔ گھر بدر ہونے کے بعد اس نے ملتان میں نو دس روز گزارے تھے۔ وہاں اس کا ایک بڑا اچھا دوست بنا تھا۔ وہ اسی کے پاس جا رہا تھا۔

اس روز رات کو اشرف ملتان میں تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ ملتان میں گرمی ویسے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے دوست کی تلاش میں دیر تک مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا نام واجد تھا' سب اسے واجد بھائی کہتے تھے۔ وہ لوہے کی گرلیں وغیرہ بناتا تھا لیکن ساتھ ساتھ پنجابی اور اردو کی شاعری بھی کرتا تھا۔ لوہے کی گرلیں اور نرم و نازک شاعری دو متضاد چیزیں تھیں۔ مگر واجد بھائی کے ہاتھوں میں یکجا ہو گئی تھیں۔ واجد بھائی کی عمر پینتیس سال سے اوپر تھی۔ انہوں نے لمبے بال رکھے ہوئے

تھے۔ چند ماہ پہلے کی طرح اس بار بھی واجد بھائی نے اشرف کو اپنی ورکشاپ میں خوش آمدید کہا۔ پچھلی مرتبہ بھی وہ اشرف سے کہتے رہے تھے کہ وہ اِدھر اُدھر آوارہ اور بیکار پھرنے کے بجائے ان کی ورکشاپ میں کام شروع کر دے۔ اس وقت اشرف کا ذہن منتشر تھا' وہ واپس لاہور جانا چاہتا تھا مگر اب وہ لاہور جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ پکے ارادوں کے ساتھ آیا تھا۔ لہٰذا جب واجد بھائی نے اس سے کام کے بارے میں کہا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔ پچھلی بار کی طرح اس بار بھی واجد نے اسے ورکشاپ میں رہنے کی اجازت دے دی۔

☆==========☆==========☆

وقت گزرتا رہا۔ رات اور دن کے پنچھی اپنے سفید اور کالے پروں سے اڑتے ایک دوسرے کے پیچھے لپکتے رہے۔ اور اسی طرح پورے چار برس گزر گئے۔ ان چار برسوں میں اشرف نے ایک بار بھی مڑ کر اپنے ماضی کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ ملتان سے باہر نکلا ہی نہیں تھا۔ واجد بھائی کام کے سلسلے میں کویت چلے گئے تھے۔ اب ان کا سب سے چھوٹا بھائی شاہد ورکشاپ چلاتا تھا۔ شاہد کی عمر اشرف سے دو تین سال ہی زیادہ ہو گی۔ وہ بھی موج میلہ کرنے والا لڑکا تھا۔ اس کی صورت میں اشرف کو ایک اچھا ساتھی مل گیا تھا۔

درحقیقت کچی عمر میں اشرف کے ذہن پر عورت کے حوالے سے جو پختہ نقش بنے تھے' انہوں نے اشرف کی کیمسٹری ہی بدل ڈالی تھی۔ عورت اس کی اٹل کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہمہ وقت عورت کے بارے میں ہی سوچتا تھا۔ کہتے ہیں کہ شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے۔ یہاں ملتان میں بھی اشرف کو ایک دو ایسے پکے ٹھکانے مل گئے تھے جہاں اس کے اندر کی پیاس بجھتی رہتی تھی۔ اس "کارِ بد" میں کبھی کبھی شاہد بھی اس کے ساتھ شامل ہوتا تھا۔ استاد جیدے کی دی ہوئی سوغات یعنی "بوتل" بھی ابھی تک اشرف کی زندگی کا حصہ تھی۔ شروع میں تو اسے ملتان آ کر کافی دقت ہوئی تھی لیکن اب شاہد کے ساتھ مل کر وہ نشے پانی کا انتظام با آسانی کر لیتا تھا.......... اس طرح سگریٹ نوشی بھی اس کی زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھی۔ اس کی یہی مصروفیات تھیں جن کے سبب اس کی صحت تیزی سے گری تھی۔ کھانسی تو خیر لاہور ہی میں شروع ہو گئی تھی' اب آدھے سر کا درد اور نزلہ بھی رہنے لگا تھا۔ شاید اس دائمی نزلے ہی کی وجہ سے اس عمر میں اس کے کچھ بال سفید ہو گئے تھے۔ وہ زیادہ قد کاٹھ بھی نہیں نکال سکا تھا۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا

جیسے وہ ایک تناور درخت بننے والا پودا ہو لیکن کسی وجہ سے ابتدا میں ہی ٹھٹھر سکڑ کر رہ گیا ہو۔

ارمان اب بھی اس کی پسندیدہ ترین فلمی اداکارہ تھی۔ وہ اب عمر میں کچھ بڑی ہو گئی تھی لیکن اس سے بھی بڑی بڑی ہیروئنیں انڈسٹری میں موجود تھیں۔ ارمان نے اپنے وزن کو کنٹرول میں رکھا ہوا تھا اور ماہر میک اپ مین اس کے چہرے کو جوان دکھانے میں کامیاب تھے۔ ہیروئن آنے کے ساتھ ساتھ ارمان اب فلمیں پروڈیوس اور ڈائریکٹ بھی کرتی تھی۔ ایک تازہ ترین فلم میں اس نے ایک نئے ہیرو کے ساتھ جو ہیجان خیز ڈانس کیا تھا' اس نے ارمان کی ابتدائی فلموں کی یاد تازہ کر دی تھی۔ اشرف نے یہ فلم تین بار دیکھی تھی۔

ارمان.......... اشرف کے دل پر بڑی گہری لگی ہوئی تھی۔ اس کے پاس قریباً بیس ویڈیو کیسٹ ایسے تھے جن میں صرف ارمان کے ڈانس اور بے باک سین تھے۔ اس کے علاوہ ارمان کی اکثر فلمیں بھی ویڈیو کیسٹس کی شکل میں اس کے پاس محفوظ تھیں۔ چند ماہ پہلے جب اشرف بہت بیمار ہو گیا تھا اور علاج کے لئے اسے پیسوں کی سخت ضرورت تھی تو اس کے دوستوں نے اسے وی سی آر اور کیسٹس بیچنے کا مشورہ دیا تھا۔ اشرف نے صاف انکار کر دیا تھا۔ ان کیسٹوں میں تو اس کی جان تھی۔

اشرف کی عمر اب بیس سال کے قریب تھی۔ یہ تو بہار کے آغاز کی عمر ہوتی ہے۔ خوشبودار' لہراتی ہوئی اور انکھیلیاں کرتی ہوئی مگر اشرف کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی عمر گزار چکا ہے۔ وہ روز بہ روز کمزور اور بیمار تر ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا' وہ پستی میں ہے اور مزید پستی کی طرف جا رہا ہے لیکن وہ خود کو روک نہیں سکتا تھا۔ اس کے چاروں طرف گندگی تھی' وہ راتوں کو اپنے اندر سیال آگ انڈیلتا تھا۔ گندی گلیوں میں چلتا ہوا' گندے کمروں میں داخل ہوتا تھا اور گند کے ساتھ لیٹ جاتا تھا۔ وہ گند کو چومتا تھا' گند سے لپٹتا تھا۔ اس کے ہاتھ مردار کا لمس محسوس کرتے تھے اور اس کے نتھنوں میں ایک سڑاند سی بھر جاتی تھی لیکن کبھی کبھی پتا نہیں ایک عجیب سی بات بھی ہوتی تھی۔ گندگی سے الجھتے ہوئے اور اس سے لپٹتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک دم کسی کی یاد آتی تھی.......... رنگی گاؤں کی طویل دوپہر اور آم کے پیڑ تلے کھڑی ایک لڑکی.......... اشرف کو تازہ ہوا کا لمس محسوس ہوتا۔ اسے یوں لگتا جیسے سڑے ہوئے کوڑے کے ڈھیر میں سے

خوشبو کا جھونکا نکلا ہو یا کسی گندگی میں سے کنول کے پھول نے سر ابھارا ہو۔

پتا نہیں کہ وہ تارا کو بھولا تھا یا بھول کر بھی نہیں بھولا تھا؟ کبھی یونہی بیٹھے بٹھائے اچانک اس کا چہرہ آسمانی برق کی طرح اشرف کی نگاہوں میں چمکتا تھا اور پھر تاریکی میں کھو جاتا تھا۔ چند مہینے پہلے کی ایک بات ابھی تک اشرف کے ذہن میں موجود تھی۔ اس دن شاہد اس کے ساتھ ہی ورکشاپ میں سویا تھا۔ صبح اٹھ کر اس نے اشرف سے کہا تھا۔

"یار، تم رات کو نیند میں بڑبڑاتے رہے ہو اور کسی تارا کا نام لیتے رہے ہو۔"

اس انکشاف پر اشرف بھونچکا رہ گیا تھا اور اس نے بڑی مشکل سے بات گول کی تھی۔

اب وہ تنہائی میں کسی وقت تارا کے بارے میں سوچتا تھا تو اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ واقعی آسمان کا تارا ہے اور وہ خود کسی گندی نالی میں رینگتا ہوا کیڑا۔ ان دونوں کے درمیان اتنا ہی فاصلہ پیدا ہو چکا تھا، جتنا آسمان اور گندی نالی کے درمیان ہو سکتا ہے۔

اس دن کام زیادہ تھا۔ شاہد نے پندرہ بیس کھڑکیوں کا آرڈر لیا ہوا تھا اور یہ کام آج رات ہر صورت مکمل کرنا تھا۔ موسم بھی کافی ٹھنڈا تھا۔ اشرف ویلڈنگ پلانٹ کے ذریعے رات بارہ بجے تک آہنی گرلوں کے ڈیزائن جوڑتا رہا اور تھک کر چور ہو گیا۔ صبح وہ اٹھا تو اسے شدید بخار تھا اور ساتھ ہی سانس کی شکایت بھی ہو چکی تھی۔ اسے جب بھی ایسی شکایت ہوتی تھی، گلے سے گیس گیس کی پریشان کن آواز نکلنے لگتی تھی۔ جب دوا کھاتا تھا تو جلد پر دانے سے نمودار ہو جاتے تھے۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا جب سخت تکلیف سے نجات پانے کے لئے اس نے دوا لینی شروع کی تو شدید خارش شروع ہو گئی۔ بخار بھی اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ تین چار دن میں ہی اس کے جسم کی نمایاں ہڈیاں نمایاں تر ہو گئیں۔

ایک دن وہ تاریک کمرے میں پڑا درد سے کراہ رہا تھا کہ شاہد اندر داخل ہوا۔

"اشرف! تجھ سے کوئی ملنے آیا ہے۔" وہ بولا۔

"کون ہے؟"

"ایک بڑی عمر کا آدمی ہے۔ ساتھ میں دو لڑکے ہیں۔ اچھے صحت مند ہیں۔ مجھے تو یہ لوگ لاہور کے لگتے ہیں۔"

اشرف ذرا سا چونکا۔ "تم نے نام نہیں پوچھا؟"

اس سے پہلے کہ شاہد جواب میں کچھ کہتا، دروازے سے کچھ فاصلے پر ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "لو........ میرا خیال ہے وہ اندر ہی آ گئے ہیں" شاہد نے گھبرا کر کہا۔

وہ تیزی سے واپس مڑا۔ اشرف نے ہمت جمع کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مگر ابھی وہ ٹھیک سے اٹھا بھی نہیں تھا کہ اس کی نظر ادھ کھلے دروازے سے باہر گئی اور وہ بھونچکا رہ گیا۔ وہ جس شخص کو خود سے آٹھ دس گز کی دوری پر دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے ماموں ارشاد تھے۔ ایک لمحے کے لئے تو اشرف کے دل میں آئی کہ وہ اٹھ کر بھاگ جائے۔ مگر اتنی مہلت نہیں تھی اور نہ ہی شاید اس میں اتنی ہمت تھی........ ماموں اندر داخل ہو گئے۔ ان کے عقب میں اشرف کے دو چچیرے بھائی، گوہر اور نعمان تھے۔ اشرف نے دیکھا۔ ماموں کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ڈھلک رہے تھے۔

☆==========☆==========☆

ماموں ارشاد، گوہر اور نعمان بیمار اشرف کس طرح ملتان سے لاہور لائے؟ لاہور میں اپنے بچھڑے ہوئے اہلِ خانہ سے اشرف کا آنسوؤں بھرا ملاپ کس طرح ہوا؟ ابا جان نے اسے کس طرح گلے لگایا؟ ماں نے کس طرح بلائیں لیں؟ یہ سب ایک طویل روداد تھی۔ مسلسل بیماری کے سبب اشرف کی خستہ حالت خستہ تر ہو رہی تھی۔ لاہور پہنچتے ہی ماموں ارشاد اسے ایک اچھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے اور اس کا دوا دارو شروع ہو گیا تھا۔

پچھلے تین چار سالوں میں اس کے گھر والوں نے مسلسل اس کی تلاش جاری رکھی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ پورا پاکستان چھان مارا تھا۔ اخبارات میں اشتہار وغیرہ بھی آئے تھے۔ اشرف کی والدہ پیروں فقیروں سے دعائیں کرانے اور تعویذ وغیرہ لینے کے لئے دربدر بھٹکتی رہتی تھیں۔ اشرف کی تلاش ایک اخباری اشتہار کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکی تھی۔ ملتان میں ایک پوسٹ مین نے یہ اشتہار دیکھا تھا اور اسے شک گزرا تھا کہ یہ لڑکا استاد واجد بھائی کی ورکشاپ پر کام کرتا ہے۔ اس نے لواحقین سے رابطہ کیا تھا اور نتیجے میں اشرف کے ماموں ملتان جا پہنچے تھے۔

چار سال پہلے اشرف پر چوری کا جو مقدمہ بنا تھا وہ بھی گھر والوں نے دے دلا کر ختم کر دیا تھا۔ اشرف کی غیر حاضری میں ہی اس کے بڑے بھائی کی شادی بھی ہوئی تھی اور وہ ایک ننھی سی بچی کا باپ تھا۔ تارا ایف ایس سی کا امتحان دے چکی تھی۔ اس نے میٹرک

بھی بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ اشرف اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ گلاب کے تازہ کھلے ہوئے پھول جیسی تھی۔ سرخ و سپید رنگت‘ گہری سیاہ آنکھیں‘ جن میں سچے موتیوں کی چمک تھی اور غیر معمولی گھنے بال۔ اشرف کی نگاہیں ایک لحظہ کے لئے اس سے ملی تھیں اور پھر خود بخود جھک گئی تھیں۔

اپنی والدہ سے اجازت لے کر ایک دن اشرف اپنے پرانے دوستوں جہانگیر اور طوطے وغیرہ سے بھی ملا۔ جہانگیر قدرے سدھر گیا تھا اور اپنے باپ کے ساتھ الیکٹرانکس کی دکان پر جاتا تھا۔ اس کی خوبرو بھابی نشاط ایک بچے کی ماں بن چکی تھی۔ دوسرا اس کے بطن میں تھا۔ نشاط کو دیکھ کر اشرف کا دل چاہا کہ وہ آج پھر اسے اپنا ہاتھ دکھائے اور اس سے پوچھے کہ زندگی کی لکیر کب تک اسے زندہ رہنے پر مجبور کرے گی۔ پتا نہیں کیوں کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا کہ اسے اس عذابِ مسلسل سے چھٹکارا مل جائے۔ اشرف طوطے سے بھی ملا۔ اشرف کی طرح اس کی بھی داڑھی مونچھ آچکی تھی۔ وہ اب غنڈوں کی طرح باقاعدہ سینہ پھلا کر چلتا تھا۔ اپنے روحانی استاد جیدے کے ساتھ مل کر اس نے بے راہ روی میں کئی منزلیں طے کر لی تھیں۔

گھر والے اب اشرف پر بھرپور نگرانی "رکھ" رہے تھے۔ اور تو اور ابا جان بھی اب اسے روزانہ کچھ وقت دیتے تھے۔ یہ وقت انہوں نے شروع میں دیا ہوتا تو شاید نوبت یہاں تک پہنچتی ہی نہیں۔ وہ سب مل کر اشرف کو سدھارنا چاہتے تھے مگر اشرف کو لگتا تھا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں۔ جو کچھ گہرائی تک اس کے اندر اتر چکا تھا‘ وہ اتنی جلدی تو اپنی جڑیں چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ان میں سے ایک جڑ "نشے" کی تھی۔ دوسری "عورت بازی" کی تیسری رندوں کی دوستی کی۔ اس طرح پتا نہیں کتنی ہی جڑیں تھیں۔ نشے کے بغیر وہ رہ نہیں سکتا تھا۔ اس کی طلب کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ ڈاکٹر کی سخت ممانعت کے باوجود‘ ماموں جان اور والدہ کو اس سلسلے میں تھوڑی سی رعایت دینا پڑی تھی۔ ماموں جان نے بڑی رازداری کے ساتھ نعمان سے بات کی تھی۔ نعمان نے اشرف کے یار جہانگیر سے کہا تھا اور وہ کہیں سے تین بوتلیں شراب کی اشرف کے لئے لے آیا تھا۔ اشرف نے ماموں سے وعدہ کیا تھا کہ ان تین بوتلوں کے ختم ہوتے ہوتے وہ اپنی عادت بھی ختم کر ڈالے گا۔ مگر اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اپنے وعدے پر پوری طرح قائم رہ سکے گا۔

بہرحال وہ اپنے طور پر خود کو سنبھالنے کی مقدور بھر کوشش کر رہا تھا۔ دوا وقت پر کھاتا تھا۔ اپنے حلئے اور لباس وغیرہ کا خیال رکھ رہا تھا۔ ایک دن وہ ششدر رہ گیا۔ وہ کمرے میں نیم دراز ریڈیو سن رہا تھا کہ اس کی امی اس کے پاس آ بیٹھیں۔ "اشرفی! ایک بڑی اہم بات کرنے آئی ہوں تیرے ساتھ۔"

"کہیں امی جان!" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور ریڈیو بند کر دیا۔

"اشرفی! تجھے پتا ہی ہے کہ تیرے ماموں تجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں‘ اور یہ پیار کوئی آج سے نہیں‘ اس وقت سے ہے جب تم دودھ پیتے تھے......... ہماری طرح وہ بھی چاہتے تھے کہ تم پڑھو لکھو اور بڑے آدمی بنو۔ اب تمہاری حالت دیکھ کر جس طرح ہم کڑھتے ہیں‘ اسی طرح وہ بھی کڑھتے ہیں۔ اور یہ بات کوئی اکیلی ان کی نہیں‘ سارے گھر والوں کی ہے۔ تمہاری ممانی بلقیس‘ تارا‘ اصغر سب تمہارے بارے میں فکر مند رہتے ہیں۔ تمہارے جانے کے بعد تارا ہمارے گھر بہت آتی جاتی رہی ہے۔ اس نے میرا اتنا خیال رکھا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ یوں سمجھو کہ اپنے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھتی رہی ہے۔ آج میں تارا ہی کے متعلق تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا؟" اشرف کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

"تمہیں شاید پتا ہی ہو کہ بچپن میں تمہارے اور تارا کے رشتے کے بارے میں زبانی کلامی بات ہوئی تھی......... ہم نے کہا تھا کہ بچے بڑے ہوں گے تو دیکھا جائے گا۔ مگر تم جس طرح "بڑے" ہوئے ہو تم جانتے ہی ہو۔ یقین کرو اشرفی! ہم سب کے دل روتے ہیں۔ اب ہم میں اتنی ہمت ہرگز نہیں تھی کہ ہم تارا کے ماں باپ سے تارا کا سوال کرتے لیکن خدا زندگی دے تمہارے ماموں کو‘ انہوں نے تم سے محبت کا حق ادا کیا ہے۔ انہوں نے کل مجھ سے اس بارے میں خود بات کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ تمہارے لئے تارا کا رشتہ دینے کے لئے تیار ہیں۔"

اشرف کا منہ کھلا رہ گیا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

اگلے دو تین روز اشرف کے لئے بڑے ہیجان خیز تھے۔ وہ تو اپنے طور پر تارا کو ہمیشہ کے لئے کھو چکا تھا۔ کہاں وہ پڑھی لکھی خوبصورت لڑکی‘ کہاں وہ انڈر میٹرک۔ بدحال اور بیمار جو سو طرح کی علتوں کا شکار تھا لیکن جو کچھ ہو رہا تھا‘ وہ عین حقیقت تھا اور اس کے سامنے تھا۔ اگلے روز آپا عارفہ نے بڑی رازداری کے ساتھ اشرف کو بتایا تھا کہ اس رشتے

میں تارا کی بھی پوری پوری مرضی شامل ہے۔ آپا نے اشرف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لڑکیوں کا دل بڑا اور طرح کا ہوتا ہے اشرفی۔ بس ایک بار جس کے نام کے ساتھ نام لگ جاتا ہے‘ اسے بھولتی نہیں ہیں۔“

اشرف نے منہ پر رومال رکھ کر کھانستے ہوئے کہا۔ ”آپ کی سب باتیں ٹھیک ہیں آپا! مگر..........“

”مگر کیا؟“

”یہ کوئی جوڑ تو نہیں ہے آپا۔ یہ تو سراسر زیادتی ہے اس کے ساتھ.......... پھر دیکھو‘ وہ اب بارہ کلاسیں پڑھ چکی ہے‘ میں نے میٹرک بھی نہیں کیا۔“

”وہ پڑھا لے گی تمہیں۔ اسے بڑا شوق ہے پڑھانے کا۔“ آپا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆==========☆==========☆

اگلے دو تین مہینے کے اندر حالات میں کافی تبدیلیاں آئیں۔ اشرف کی صحت قدرے بہتر ہو گئی۔ وہ نشہ چھوڑنے کی بھی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ سگریٹ نوشی جو تین ڈبی روزانہ تک پہنچ چکی تھی‘ اب نصف ڈبی روزانہ رہ گئی۔ بہرحال اس کا جسم اب بھی منحنی تھا اور آنکھیں گہرائی میں اتری ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے سر کے سفید بالوں کو رنگنا شروع کر دیا تھا۔ اس تبدیلی نے اس کی مجموعی شکل و صورت کو بہتری دے دی تھی۔

اب وہ کبھی کبھار ابا جان کے ساتھ چاولوں کے سیل ڈپو پر بھی چلا جاتا تھا لیکن اس کام میں اس کا دل کچھ جمتا نہیں تھا۔ دونوں گھرانوں میں شادی کی تیاری زور شور سے ہو رہی تھی۔ آپا عارفہ‘ امی‘ بھائی‘ چچا رشید کی بیٹیاں‘ سب کے سب بازاروں کے چکر لگا رہے تھے.......... ایک دو بار اشرف نے دور دور سے تارا کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کا حسین رنگ دیکھ کر اشرف کے جسم میں زندگی کی جوت جاگ گئی تھی۔ تاہم وہ کوشش کے باوجود تارا سے کوئی بات نہیں کر سکا تھا۔

وہ تارا کے جذبہ ایثار اور محبت کو پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اشرف کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ اشرف کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ آج تک بس سرابوں کے پیچھے ہی بھاگتا رہا ہے۔ اس کی منزل تو وہی ٹھنڈے میٹھے صاف پانی کا چشمہ تھا جو اس کے بالکل قریب بہہ رہا تھا۔ بس اس نے یہ

کیا کہ اس چشمے کے پوری طرح پھوٹنے سے پہلے ہی اسے استعمال میں لانا چاہا اور نتیجے میں یہ حیات بخش پانی اس سے روٹھ گیا۔ اب وہ چشمہ اپنے پورے بہاؤ پر تھا اور اشرف کی پرانی نادانیوں اور بے صبریوں کو درگزر کر کے اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔

وہ اکتوبر کی ایک سہانی شام تھی۔ اشرف اور تارا کی شادی ہو گئی۔ ہر طرف خوشی ایک پھوار کی طرح برس رہی تھی۔ مگر مستقبل قریب کے پردے میں ابھی کچھ اور بھی چھپا ہوا تھا۔ ماموں کے گھر سے اپنی دلہن لے کر اشرف رات گیارہ بجے کے قریب اپنے گھر واپس آیا۔ دلہن کی آمد پر گھر میں جو چھوٹی موٹی رسمیں ہوتی ہیں‘ وہ ادا کی جا رہی تھیں۔ تارا سرخ جوڑے میں گٹھری سی بنی بیٹھی تھی۔ اس کے گرد چمکتی لشکتی قہقہے بکھیرتی لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ اشرف کی بے تاب نگاہیں اس ہجوم کے اندر سے راستہ بنا کر تارا تک پہنچنا چاہ رہی تھیں۔ اسی اثنا میں اشرف کا چچا زاد بھائی نعمان اس کے قریب آیا اور سرگوشی کے سے لہجے میں بولا۔ ”اشرف‘ تمہارے لئے ایک بری خبر ہے۔“

”کیا ہوا؟“

”ذرا باہر آؤ۔“

اشرف لرزتی ٹانگوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں پہنچا۔ یہاں کسی کی فون کال تھی ریسیور میز پر رکھا تھا۔ اشرف نے ریسیور کان سے لگایا‘ دوسری طرف جہانگیر تھا۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”اشرفی! طوطے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے‘ میو اسپتال میں ہے۔ پتا نہیں بچتا بھی ہے یا نہیں.......... وہ تمہیں بلا رہا ہے۔“

اشرف سناٹے میں رہ گیا۔ وہ طوطے اور اس جیسے دوسرے دوستوں سے دور ہو گیا تھا۔ طوطے کو اس نے شادی میں بھی نہیں بلایا تھا لیکن طوطے کے ایکسیڈنٹ کی خبر سن کر اور یہ سن کر کہ وہ اسے بلا رہا ہے‘ اشرف کے دل کو کچھ کچھ ہونے لگا۔ کچھ بھی تھا آخر‘ اس نے اپنے اس دوست کے ساتھ طویل وقت گزارا تھا۔ اس نے نعمان کو ساتھ لیا اور موٹر سائیکل پر سوار ہو کر میو اسپتال پہنچ گیا۔ وہاں کچھ اور جان پہچان والے لڑکے بھی موجود تھے۔ طوطے کو سر اور ٹانگوں پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر پہلے بے ہوش ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ اس کے لئے فوری خون کی ضرورت ہے۔ ان کے خیال میں سات آٹھ بوتلیں تو فوری طور پر درکار تھیں۔ کئی لڑکے خون دینے پر آمادہ نظر آ رہے تھے۔ اشرف کی اپنی صحت کافی کمزور تھی لیکن وہ بھی خون دینے کو تیار نظر آ رہا

تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خون دے نہیں سکا۔ اسپتال پہنچ کر یہ اڑتی اڑتی سی بات بھی اشرف کے کانوں تک پہنچی کہ طوطا کوئی چھوٹی موٹی واردات کر کے بھاگ رہا تھا۔

تارا دلہن بن کر خوش تھی۔ یہ سب کچھ اس کی دلی خواہش کے مطابق ہوا تھا۔ وہ مشرقی لڑکی تھی جو زندگی میں بس ایک بار محبت کرتی ہے اور اس نے اشرف سے کی تھی۔ ماضی بہت تلخ تھا لیکن حال قدرے بہتر نظر آرہا تھا۔ لاہور واپس آنے کے بعد اشرف نے خود کو کافی حد تک سنبھالا تھا۔ شیشہ دکھائی کی رسم کے دوران میں اس نے چور نظروں سے اشرف کو دیکھا تھا۔ وہ کمزور تو اب بھی تھا لیکن اس کے چہرے سے پژمردگی اب کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔

وہ دلہن بن کر اشرف کے گھر آگئی تھی۔ رات گئے اسے پتا چلا تھا کہ اشرف کے کسی دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ موٹر سائیکل سے گر کر بری طرح زخمی ہوا ہے اور اسپتال میں ہے۔ اشرف اس کی خبر گیری کے لئے گیا تھا۔ وہ ساری رات واپس نہیں آسکا۔ صبح سویرے معلوم ہوا کہ اس کا دوست اسپتال میں چل بسا ہے۔

اگلا دن تجہیز و تکفین میں گزر گیا تھا۔ اشرف شام کے بعد ہی گھر واپس آیا۔ وہ غم زدہ اور نڈھال لگتا تھا۔ رات کو دونوں بستر پر پاس پاس لیٹے رہے۔ اشرف نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا تھا' انگوٹھی بھی پہنائی تھی۔ دونوں بستر پر نیم دراز ہو گئے تو اشرف نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے پھر سو گئے۔

اگلے تین چار روز بھی اسی طرح گزرے۔ تارا جانتی تھی کہ اشرف کے دل پر دوست کی اچانک موت کا بوجھ ہے۔ وہ ہلکی پھلکی گفتگو کرتی رہتی تھی تاکہ وہ جلد نارمل ہو سکے۔ اشرف کے بھائی جان چاہتے تھے کہ تارا اور اشرف دو چار دن کے لئے مری چلے جائیں مگر اشرف نے ٹال مٹول کر دی۔ جب پورے دو ہفتے اسی طرح گزر گئے تو تارا کو الجھن ہونے لگی۔ شادی کے بعد دلہن کے جو ارمان ہوتے ہیں' وہ تارا کے سینے میں مچل رہے تھے۔ اشرف کی قربت اس کی سانسوں کی آمدورفت کو تیز کر دیتی تھی اور اس کے بدن میں بے کلی کی لہر سی دوڑنے لگتی مگر اس کے جذبوں کی آنچ شاید اشرف تک پہنچتی ہی نہیں تھی۔ اس کے دل میں وسوسے جاگنے لگے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اشرف کی دوری کی کوئی اور وجہ ہو' کہیں............ وہ تارا سے، ماضی کی کسی بات کا بدلہ تو نہیں لے رہا تھا۔ پرانی باتیں تھیں لیکن ان کے وجود سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک مرتبہ

تارا نے اشرف کو اپنے قریب آنے پر بری طرح جھڑکا تھا۔ پھر ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا تھا کہ تارا کی امی نے غصے میں آکر اشرف کو طمانچہ دے مارا تھا۔ کہیں اشرف کے دل میں کسی ایسے واقعے کی گرہ تو نہیں پڑی ہوئی تھی۔

اس کی شادی کو تین ہفتے ہونے کو آئے تھے لیکن وہ ابھی تک پہلی رات کی دلہن ہی تھی۔ اس کی یہ حیثیت اسے بے تکلفی کی اجازت تو نہیں دیتی تھی پھر بھی ایک رات ہمت کر کے اس نے اپنی بانہیں اشرف کے گلے میں ڈال دیں۔ "کیا بات ہے' آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟"

"کیوں' تم نے کوئی ناراض کرنے والی بات کی ہے؟" اس نے الٹا سوال پوچھا۔

"کی تو ہے۔" وہ ذرا شوخی سے بولی۔ "آپ کی دلہن بنی بیٹھی ہوں۔"

"یہ تو............ تمہاری قربانی ہے۔"

"قربانی نہیں............ محبت۔" اس نے جرأت کر کے کہا۔

اشرف نے آہستگی کے ساتھ اس کی بانہیں اپنے گلے سے ہٹا دیں اور اس کے قریب ہی نیم دراز ہو گیا۔ وہ کسی گہری' بہت گہری سوچ میں نظر آتا تھا۔ وہ دونوں پاس پاس لیٹے رہے۔ ایک عورت کی حیثیت سے تارا کی حسیات بہت تیز تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ اشرف خدانخواستہ اس سے بیزار نہیں ہے۔ اس کا قرب اشرف کو بھی بے چین کرتا ہے۔ اس کے سینے میں بھی خواہشیں مچلتی ہیں۔ مگر وہ جان بوجھ کر تارا کے ساتھ اپنی دوری برقرار رکھتا ہے اور یہی بات تارا کے لئے زیادہ الجھن پیدا کرتی تھی۔ وہ کیوں اسے بانہوں میں بھر نہیں لیتا۔ وہ ساری شدتیں جو اس کی آنکھوں میں نظر آتی ہیں کیوں تارا کے تن من تک نہیں پہنچتیں؟ آخر کیوں؟

وہ کئی دن تک اپنے دولہا کو ریجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ کبھی کبھی اس کوشش میں ایک مشرقی دلہن کی حد سے آگے بھی نکل گئی لیکن نتیجہ وہی رہا۔ تارا کو لگتا تھا کہ کوئی بہت بھاری' بہت ناقابل برداشت بوجھ ہے اشرف کے سینے پر جو دن رات اس کے دل کو کچلتا رہتا ہے۔ پھر ایک روز آدھی رات کے وقت تارا نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ اشرف اس کے ساتھ بیڈ پر موجود نہیں تھا۔ باتھ روم کے اندر سے ٹوٹ پھوٹ کی عجیب سی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ اٹھی اور لپک کر باتھ روم کا دروازہ کھولا۔ اس نے دیکھا کشادہ باتھ روم میں ویڈیو کیسٹوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ درجنوں کیسٹس تھیں۔ ان میں

سے بہت سی اشرف نے فرش پر پٹخ کر توڑ دی تھیں۔

"اشرف یہ کیا کر رہے ہیں؟" تارا حیرت سے بولی۔

"اس حرام زادی کو جلا رہا ہوں۔ اس کو ختم کر رہا ہوں۔" وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولا اور اسی وقت تارا کو اندازہ ہوا کہ وہ نشے میں ہے۔

"کس کو جلا رہے ہو؟"

"اس حرام زادی کو جس کی فلمیں ان کیسٹوں میں ہیں.......... اسی کتیا نے میری زندگی برباد کی ہے" وہ پھنکارا۔

پھر اس نے بیسن کے قریب رکھا ہوا پلاسٹک کا گیلن اٹھایا اور اس میں موجود پٹرول ان کیسٹوں پر انڈیلنے لگا۔ تارا ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ اشرف نے جیب سے ماچس نکالی اور دیا سلائی جلا کر کیسٹوں پر پھینک دی۔ باتھ روم میں شعلے رقص کرنے لگے۔ صابن دانی' تولیہ' شیونگ برش' پلاسٹک کی بالٹی اور اسی طرح کی کئی چھوٹی موٹی چیزیں' آگ کی زد میں آئیں اور کیسٹوں کے ساتھ ہی جل گئیں۔

تارا رو رہی تھی اور لرز رہی تھی۔ اشرف نے بڑی نرمی کے ساتھ اسے گلے سے لگایا۔ "مت رو تارا.......... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تُو تو بڑی بہادر لڑکی ہے' تجھے نہیں رونا چاہیے۔ بالکل نہیں رونا چاہیے۔"

پھر تارا کو بستر پر بٹھا کر وہ گھر کی چھت پر چلا گیا اور ٹہلنے لگا۔ تارا سہمی ہوئی تھی۔

☆========☆========☆

یہ دو روز بعد کی بات ہے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور کبھی کبھی بجلی بھی چمک جاتی تھی۔ ٹھنڈی ہوا نے نومبر کی اس سرد رات کو اور بھی یخ بستہ کر دیا تھا۔ اشرف نے پتلون پر جیکٹ پہن رکھی تھی۔ گلے میں مفلر تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور بال الجھے ہوئے تھے۔ آج اسے پھر بخار تھا۔ ناک کے اندر سوزش سی ہو گئی تھی اور بازوؤں ٹانگوں پر بھی الرجی کے سے آثار تھے۔ اس نے گھر سے روانہ ہوتے وقت دو پیگ لگا لئے تھے اور اب ٹھنڈی ہوا اس کی ترنگ میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ چلتا چلتا ایک اسٹریٹ لائٹ کے نیچے رکا اور پتا نہیں کیوں خالی خالی نظروں سے اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو دیکھنے لگا۔ ایک بھولی بسری آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ یہ جہانگیر کی بھابی نشاط کی آواز تھی۔ "اشرف۔ تمہاری شادی کی لکیر بڑی ٹیڑھی میڑھی ہے.......... خیر چھوڑو' یہ دیکھو'

یہ زحل کے ابھار کے نیچے جو چھوٹی چھوٹی لائنیں ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم اپنی بیوی کو شدید محبت دینے کی خواہش رکھو گے۔"

اشرف کے سینے سے آہ سی نکلی اور آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ اس نے سوچا' شاید نشاط ٹھیک ہی کہتی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو شدید محبت دینے کی خواہش رکھتا تھا۔ اسے عمر بھر اپنی بانہوں میں بھر کر رکھنا چاہتا تھا لیکن.......... آہ حالات نے اسے کن پستیوں میں گرایا تھا۔ وہ اشرف المخلوقات تو کیا اشرف بھی نہیں رہا تھا۔

اس نے چند سیکنڈ کھانسنے کے بعد زمین پر تھوکا اور ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ وہ جوں جوں آگے آگے بڑھ رہا تھا' اس کی آنکھوں کی سرخی گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے جسم کے رگ و پے سخت ہو رہے تھے۔ مزنگ چونگی کے اسٹاپ سے وہ ویگن پر سوار ہوا اور گلبرگ نمبر دو پہنچ کر اتر گیا۔ اب رات کا ایک بج چکا تھا۔ سڑکوں پر سناٹا تھا۔ کسی وقت ہلکی سی پھوار بھی پڑنے لگتی تھی۔ وہ چند دن پہلے بھی اس علاقے میں آچکا تھا۔ اس نے پورا سروے کیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ قریباً تین فرلانگ پیدل چلنے کے بعد وہ ایک وسیع کوٹھی کے عقب میں پہنچ گیا۔ کوٹھی کی باؤنڈری وال کافی اونچی تھی لیکن ایک درخت کی جھکی ہوئی شاخیں باؤنڈری وال سے چھو رہی تھیں۔

دبلے پتلے جسم کا مالک اشرف آسانی سے درخت پر چڑھا اور پھر باؤنڈری وال سے چھلانگ لگا کر کوٹھی کے احاطے میں پہنچ گیا۔ اس کے پاس مکمل معلومات تھیں۔ اسے پتا تھا کہ کوٹھی کے دو پٹھان چوکیداروں میں سے ایک چھٹی پر ہے' دوسرا مین گیٹ پر تھا۔ اشرف دبے پاؤں اندرونی عمارت کے دروازے تک پہنچا۔ اسے معلوم تھا کہ اب اسے سب سے مشکل مرحلہ طے کرنا ہے۔ اندرونی عمارت کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اسے یہ دروازہ کھلوانا تھا۔ اسے صحن میں کرکٹ کا ایک بیٹ پڑا نظر آیا۔ اس نے بیٹ کو ایک کھڑکی کی آہنی گرل سے ٹکرا ٹکرا مسلسل آواز پیدا کی۔ اس آواز کا نتیجہ حسب توقع ہی نکلا۔ کچھ دیر بعد ایک اندرونی کمرے کی لائٹ روشن ہوئی اور پھر کسی نے بھاری آواز میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

اشرف خاموش رہا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے پھر کرکٹ بیٹ کی مدد سے ٹھک ٹھک شروع کر دی۔ بھاری آواز نے دو تین مرتبہ پھر پوچھا کہ کون ہے؟ اس کے بعد قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اشرف کرکٹ بیٹ تھام کر تیار ہو گیا اور دروازے کے بالکل ساتھ لگ کر

کھڑا ہو گیا۔ کسی شخص نے اندر سے چٹخنی گرائی اور سر نکال کر باہر جھانکا۔ اس کا سر نکالنا، اس کے سر پر قیامت توڑ گیا۔ کرکٹ بیٹ پوری قوت سے اشرف نے اس کے سر پر مارا تھا۔ مضروب ایک کراہ کے ساتھ نیچے گرا۔ اشرف نے بلا توقف دوسری ضرب اس کے سر پر لگائی ”کھٹاک“ کی تسلی بخش آواز آئی۔ مضروب ایک جھٹکے کے ساتھ تھوڑا سا اینٹھا اور ساکت ہو گیا۔ وہ اٹھائیس تیس سال کا ایک تنومند شخص تھا۔ اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کی جیب سے موبائل فون لڑھک کر گر گیا تھا۔ اشرف نے فون بند کر کے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔ ”کون ہے باہر؟“

آواز سنتے ہی اشرف نے جیکٹ کے اندر سے بھرا ہوا ماؤزر نکال لیا۔ اس کے سینے میں سلگتی ہوئی آگ الاؤ بنتی جا رہی تھی۔ ایک فربہ اندام نوکرانی باہر آئی۔ اشرف نے ماؤزر اس کی طرف سیدھا کیا۔ ”خبردا آواز نہ نکلے۔“ وہ غرایا۔

نوکرانی کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ اشرف نے نوکرانی کو ایک باتھ روم میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ اس نے دہشت زدہ نوکرانی کو بڑی اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اگر اس نے کوئی آواز نکالی تو وہ اس کی زندگی کی آخری آواز ہو گی۔

چاروں طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اور بے ہوش شخص کو گھسیٹ کر ایک دوسرے باتھ روم میں مقفل کرنے کے بعد اشرف بڑی آہستگی سے دوسری منزل پر پہنچا۔ یہ کوٹھی کم و بیش تین کنال میں واقع تھی۔ ممکن تھا کہ یہاں ایک دو مزید ملازم بھی موجود ہوں۔ مگر وہ تھے بھی تو یقیناً رات کے اس پہر گہری نیند سو رہے تھے۔ باہر اب بارش شروع ہو گئی تھی اور گاہے گاہے بادل بھی گرج رہے تھے۔ اشرف راہداری میں بچھے دبیز قالین پر چلتا وسطی حصے کی طرف بڑھا۔ وہ چند دروازوں کے پاس کھڑا ہو کر سن گن لیتا رہا۔ ایک دروازے کے اندر سے اسے میوزک بجنے کی مدھم آواز آئی۔ ماؤزر پر اشرف کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ اس نے دروازے پر مدھم دستک دی۔ ”آئی!“ اندر سے ایک سریلی نسوانی آواز ابھری۔

پھر کسی نے دروازے کا بولٹ گرا کر دروازہ کھولا اور بغیر اس کی طرف دیکھے واپس چلی گئی۔ اشرف ماؤزر تھامے کمرے میں گھسا اور دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ کھولنے والی اس کی طرف پشت کئے کھڑی تھی اور ہاتھوں کے ناخنوں پر نیل پالش لگا رہی تھی۔ ”کہاں

چلے گئے تھے سویٹی!“ اس نے اشرف کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

پھر اچانک اس کی نظر سامنے آئینے پر پڑی اور اشرف کو دیکھ کر وہ تیزی سے گھومی۔ اس کا منہ چیخ مارنے کے لئے کھلا تھا مگر اشرف کے ہاتھ میں ماؤزر اور آنکھوں میں وحشت دیکھ کر آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔

”خبردار.......... آواز نہیں نکلنی چاہئے۔“ اشرف نے ماؤزر کی نال عین اس کے چہرے کے سامنے کر دی۔

”کک.......... کون ہو تم؟“ اس نے دہشت زدہ لہجے میں پوچھا۔

اشرف خاموشی سے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ جو عورت اس کے سامنے کھڑی تھی وہ جواں سال ہی لگتی تھی۔ اس کا رنگ میدے کی طرح تھا۔ نقش خوبصورت اور جسم میں کشش تھی۔ وہ شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ کھلے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اشرف کی خاموشی نے اسے مزید دہشت زدہ کر دیا۔ ”میں پوچھتی ہوں کک.......... کون ہو تم؟“ وہ پھر ہکلائی۔

وہ بولا۔ ”تم مجھے نہیں جانتی ہو لیکن میں تمہیں جانتا ہوں اور مجھ جیسے ہزاروں لاکھوں لوگ تمہیں جانتے ہیں۔ تم فلم اسٹار ارمان ہو۔ پچھلے پندرہ سالوں سے تم نے اسکرین پر تہلکہ مچا رکھا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟“

”تم کیا چاہتے ہو؟“ وہ پیچھے کھسکتے ہوئے بولی۔

اشرف کو شک گزرا کہ شاید وہ ٹیلی فون تک پہنچنا چاہ رہی ہے یا کسی گھنٹی وغیرہ کا خفیہ بٹن دبانا چاہ رہی ہے۔ ”خبردار! اپنی جگہ کھڑی رہو ورنہ میں گولی مار دوں گا۔“ وہ اتنی وحشت سے غرایا کہ وہ پتھر کا بت بن گئی اور اس کا رنگ برف کے مانند ہو گیا۔

اس وسیع خواب گاہ میں خوش گوار حرارت تھی۔ جہازی سائز کے بیش قیمت میوزک یونٹ پر کسی انڈین گانے کی دھن ہلکی آواز میں بج رہی تھی۔ خواب گاہ میں الکحل کی ہلکی سی بو بھی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے تک یہاں مے نوشی ہوتی رہی ہے۔ ایک طرف الماری میں بڑی خوبصورتی سے وہ درجنوں ایوارڈز سجائے گئے تھے جو ارمان نے پچھلے برسوں میں حاصل کئے تھے۔ سامنے دیوار پر ارمان کی ایک توبہ شکن تصویر تھی۔ رقص کا یہ ہیجان خیز انداز کسی تازہ فلم سے لیا گیا تھا۔ غالباً اس تصویر کے ذریعے ارمان نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس کا جسم آج بھی ہوشربا

ہے۔

اشرف نے کہا۔ "اپنے جس سیکریٹری کے ساتھ تم اس کوٹھی میں بغیر شادی کے رہ رہی ہو۔ وہ اس وقت نیچے ایک باتھ روم میں بند ہے اور بے ہوش پڑا ہے۔ باقی ملازموں میں سے بھی اس وقت کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا اور اگر آئے گا تو میری گولی کا نشانہ بنے گا۔ لہٰذا کسی طرح کی بہادری نہ دکھانا۔ میں جانتا ہوں ایسی بہادریاں صرف فلموں میں چلتی ہیں۔"

وہ سہم کر بیڈ کے ایک کونے پر بیٹھ گئی۔ اس کے خوبصورت ہاتھ مسلسل کانپتے چلے جا رہے تھے۔ وہ بولی۔ "دیکھو۔ اگر تمہیں پیسہ چاہئے تو میں تمہیں دے سکتی ہوں۔ تم نوجوان ہو' اس طرح اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالو۔"

وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "میں تمہیں جوان نظر آتا ہوں؟ ایسے ہوتے ہیں نوجوان؟ ایسے ہوتے ہیں؟" اس نے اپنی ٹھوڑی کو اپنے ہی ہاتھ میں پکڑ کر اپنا چہرہ ارمان کے سامنے کیا۔ "میں نوجوان نہیں ہوں.......... میں بیماریوں کا کھایا ہوا اور نشوں کا مارا ہوا بیس سالہ بوڑھا ہوں.......... ہاں' بیس سالہ بوڑھا ہوں میں.......... تم نے مجھ پر جوانی آنے ہی نہیں دی.......... بچپن سے سیدھا بڑھاپے میں داخل کیا ہے مجھے تم نے۔ اور میں ایک نہیں ہوں' میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ہوں۔ اور پورے ملک میں بکھرا ہوا ہوں۔" وہ نشے میں تھا اور عجیب لہجے میں بول رہا تھا۔

"مم.......... میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"تم اتنی انجان نہیں ہو' تم سب سمجھتی ہو۔ بہت خرانٹ ہو تم لیکن تمہاری ایکٹنگ کا کمال ہے کہ تمہارے چہرے پر بھی معصومیت رہتی ہے.......... تم نے پندرہ سال تک مجھ جیسے بے وقوفوں کی زندگیاں برباد کی ہیں۔ تم اور تمہارے جیسی دوسری فلمی پریاں ہمیں اپنا دیوانہ بناتی ہیں۔ اپنے نخروں اور اپنی اداؤں سے ہمارے اندر آگ بھڑکاتی ہیں۔ پھر خود تو اونچی دیواروں کے پیچھے جاکر چھپ جاتی ہیں اور اپنے چاروں طرف گارڈز کا پہرا بٹھا لیتی ہیں۔ ہم اپنے آپ سے ٹکراتے ہیں' اپنے اردگرد سے ٹکراتے ہیں۔ تارا جیسی لڑکیاں ہمارے نشانے پر آجاتی ہیں۔ تمہاری بھڑکائی ہوئی آگ کہاں کہاں آگ لگاتی ہے' تمہیں کچھ پتا نہیں ہوتا۔"

"یہ.......... یہ تارا کون ہے؟" ارمان نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

"خبردار.......... خبردار کتیا! اس معصوم کا نام نہ آئے تیری ناپاک زبان پر.......... اس کا نام نہ آئے۔ تو اس کی خوشیوں کی بھی قاتل ہے۔" اشرف نے جنونی انداز میں کہا اور دونوں ہاتھوں میں پکڑا ہوا ماؤزر ارمان کی کنپٹی سے لگا دیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ وہ حالات کی شدید ترین سنگینی کو پہچان گئی ہے اور اب اس افتاد سے نکلنے کی تدبیر سوچ رہی ہے۔

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اپنے بالوں کی لٹوں کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بھرپور نظروں سے اشرف کو دیکھا۔ سلیپنگ گاؤن کے کھلے گریبان میں سے اس کا دودھیا جسم جھلک رہا تھا۔ وہ نیل پالش کا برش اٹھانے کے لئے قالین کی طرف جھکی تو جسم اور بھی نمایاں ہو گیا۔ وہ بولی۔ "تم نے مجھ پر ماؤزر تان رکھا ہے لیکن.......... یقین کرو' مجھے پھر بھی تم پر غصہ نہیں آرہا۔ آخر کوئی وجہ تو ہوگی جس نے تمہیں اتنا برہم کیا ہے۔ تم یہ اسلحہ ایک طرف رکھ کر اطمینان سے بیٹھو' میں تمہاری ہر بات سنوں گی۔" کوشش کے باوجود اس کے لہجے میں لرزش تھی۔

"میں تجھے کچھ سنانا نہیں چاہتا ہوں۔" وہ غرایا۔

ارمان نے تھوک نگل کر حلق تر کرنے کی ناکام کوشش کی پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "دیکھو' اگر تم بیمار ہو تو.......... تمہارا علاج ہو سکتا ہے۔ کوئی ایسا روگ نہیں جس سے چھٹکارا ممکن نہ ہو.......... مم.......... میرے سیف کی چابی اس سامنے والے گلدان کے نیچے پڑی ہے۔ وہ سیف کھول لو۔ اس میں جو کچھ ہے لے لو۔ تم دنیا کے جس ملک میں چاہو گے جاکر اپنا علاج کرا سکو گے.......... تمہاری زندگی بدل جائے گی۔"

"میری زندگی تو بدل چکی ہے اور اب میں تمہاری زندگی بدلنے یہاں آیا ہوں۔ مجھے سیف اور اس میں رکھی دولت سے کوئی سروکار نہیں ہے.........." اسے کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔

"پھر تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"اپنی تمام تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کے لئے۔ میں تم سے اپنی تمام محرومیوں کا حساب لوں گا۔ تم نے بہت بچپن سے مجھے اپنا دیوانہ بنا رکھا ہے۔ میں نے تمہارے خواب دیکھے پھر ان خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے میں نے کم عمری میں ہی اُس بازار کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ مگر وہاں بھی مجھے سکون نہیں مل سکا بلکہ میری طلب میں مسلسل اضافہ

ہوتا رہا۔ ہر طوائف کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی مجھے تمہارا خیال رہتا تھا۔ میں ان سب میں تمہیں تلاش کرتا تھا مگر ناکامی کے بعد میری پیاس اور بڑھ جاتی تھی اور آج میں سیراب ہونے یہاں آگیا ہوں۔"

ارمان کا خوف کم ہونے لگا تھا۔ اس کی خوف سے پھیکی پڑتی رنگت میں زندگی دوبارہ لوٹنے لگی تھی۔

"اس کے بعد تم واپس لوٹ جاؤ گے؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"بالکل' اس کے علاوہ مجھے کچھ درکار نہیں ہے۔" اشرف نے جواب دیا۔

"اور اگر میں انکار کر دوں تو..........؟"

"تم اس وقت انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔" یہ کہتے ہی اشرف اس پر جا پڑا۔

اشرف کی وحشت ارمان کے لئے ایک بالکل نئی شے تھی۔ اس نے کسی قسم کی مزاحمت کی کوشش ہی نہیں کی جس پر پہلے پہل اشرف کو بھی شدید حیرت ہوئی مگر پھر اس کی حیرت اس کی وحشتوں کی شدت میں بہہ گئی۔

اس کے بعد کا وقت بہت تیزی سے گزرا۔ صبح جب اشرف کے حواس بحال ہوئے تو اس نے ارمان کو گہری اور پُر سکون نیند میں ڈوبے ہوئے پایا۔ اسے دیکھ کر اشرف کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ اٹھا اور جس طرح گھر میں داخل ہوا تھا اسی طرح باہر نکل آیا۔

☆==========☆==========☆

تارا کی عجیب کیفیت تھی۔ اشرف گزشتہ تمام رات گھر سے باہر رہا تھا اور صبح جب لوٹا تھا تو جسمانی پژمردگی کے باوجود اس کے انداز میں سرمستی اور سرخوشی واضح طور پر محسوس کی جاسکتی تھی۔ وہ آیا تھا اور آتے ہی سو گیا تھا۔ تارا اس کے ماضی سے بہ خوبی واقف تھی جس کے باعث عجب عجب خیال نشتر بن کر اس کے دل و دماغ میں چبھ رہے تھے۔

اب پھر رات ہونے کو آئی تھی اور اشرف غائب تھا۔ رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ جب اشرف تارا کے کمرے میں آیا اور محبت بھرے انداز میں پکارا۔ "تارا کیا سو گئی ہو؟"

تارا کب سوئی تھی وہ تو کب سے جاگ رہی تھی۔ اشرف کی آواز پر فوراً اٹھ بیٹھی۔ "نہیں میں جاگ رہی ہوں۔"

"اچھا تو آؤ آج کچھ باتیں کریں گے۔" اشرف نے کچھ عجب طرح کی یاسیت سے کہا اور تارا چونک اٹھی۔

اشرف اس کی کیفیت سے بے خبر تھا۔ وہ اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گیا اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولنا شروع کر دیا۔ "تم میرے حالات سے بہت اچھی طرح واقف ہو۔ میرا کوئی بھی کارنامہ تم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود تم نے مجھے چاہا' مجھ سے محبت کی اور مجھ سے شادی کر کے محبت کی انتہا کر دی۔ تم سوچتی ہو گی کہ شاید میں تم سے ناراض ہوں' اس شادی پر خوش نہیں ہوں۔ ایسا نہیں ہے اور ایسا ہے بھی۔ شادی ہونے سے پہلے تک میں بھی تم سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں بھی بہت خوش تھا مگر شادی کی رات وہ قیامت کی رات تھی جب میرا سب کچھ مجھ سے چھن گیا۔ میں لٹ گیا' میں برباد ہو گیا۔" وہ عالم خواب کی سی کیفیت میں بول رہا تھا۔ "تم جانتی ہو میری بربادی کی ابتداء کہاں سے ہوئی تھی؟" اس نے پوچھا پھر خود ہی جواب دینے لگا۔ "میری بربادی کی ابتداء فلم اسٹار ارمان سے ہوئی۔ اس نے میرا سب کچھ لوٹ لیا۔ تمہیں بھی مجھ سے چھین لیا۔ تمہارے ساتھ میری شادی ہوئی تھی۔ میری خوشیوں کی سیج سجی تھی۔ شادی کی رات طوطے کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ میں اسے خون دینے کے لئے اسپتال گیا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا' میں اپنی برباد زندگی کا اصل روپ دیکھنے جا رہا ہوں۔ ڈاکٹر نے میرا خون ٹیسٹ کیا اور مجھے روک لیا۔ رات رات میں میرے دو تین ٹیسٹ اور ہوئے اور پھر مجھے پتا چلا کہ میں دولہا نہیں ہوں' میں تو قبر میں ٹانگیں لٹکا کر بیٹھا ہوا مریض ہوں۔ کسی بھی وقت مجھ پر منوں مٹی سوار ہو سکتی ہے۔ اپنی خوفناک بیماری کا پتا چلنے کے بعد میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہارے قریب جاؤں۔ اس تارا کے قریب جاؤں جس نے میرے لئے محبت اور قربانی کی اخیر کر دی تھی۔ میں اس کے صلے میں اپنی خواہشوں کی خاطر' اسے موت دے دیتا تو مجھ سے بڑا کمینہ اور کون ہوتا۔ میں اب تمہیں بتا رہا ہوں کہ مجھے ایڈز ہو چکی ہے۔" تارا چونک اٹھی مگر اس کے منہ سے کوئی لفظ ادا نہیں ہوا۔

"میں نے شادی کے بعد چند جو ہفتے گزارے ہیں' ان کی تکلیف کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ تمہارے قریب رہ کر صبر کا ایک بڑا لمبا امتحان میں نے دیا ہے۔ یہ دن بڑے مایوس

اور بے چین گزرے ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں؟ اپنی برباد زندگی کا حساب کس سے مانگوں۔ میں نے بہت سوچا........... میں جانتا ہوں مجھے ایڈز کی بیماری ایک طوائف سے لگی ہے۔ اس کا نام رانو تھا۔ وہ میری زندگی میں آنے والی پہلی عورت تھی.......... لیکن رانو کے پاس مجھے لے کر کون گیا تھا؟ ارمان لے کر گئی تھی.......... ہاں' ارمان لے کر گئی تھی۔' میرے کچے ذہن کو گندگی سے لت پت کرنے والی ارمان تھی۔ میں نے چودہ سال کی عمر میں "کارنامے" انجام دینے شروع کر دیئے تھے۔ پتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ میرے دماغ پر ارمان کا قبضہ تھا۔"

اسے اچانک کھانسی کا دورہ پڑا۔ حلق سے گیں گیں کی آواز نکلنے لگی۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھالا اور سگریٹ کو قریبی ایش ٹرے میں مسل کر بولا۔ "پچھلے دنوں میں' میں نے بہت سوچا ہے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ ایک بہت بڑا میدان ہو۔ میں دنیا بھر کی ڈشیں' وی سی آر' لچر فلمیں اور گندی تصویریں اس میدان میں جمع کروں' ان پر ہزاروں لیٹر پیٹرول چھڑک کر انہیں آگ لگا دوں.......... یا اس طرح کا کوئی اور ایسا کام کروں جس سے آج کی نوجوان نسل کو برباد کرنے والی ہر برائی جل کر راکھ ہو جائے.......... مگر پھر سوچا' یہ تو سب خیالی باتیں ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا.......... ہاں تارا' ایسا نہیں ہو سکتا.......... برائی بہت پھیلی ہوئی ہے۔ میں یہ ساری برائی ختم نہیں کر سکتا۔ نہیں کر سکتا نا..........؟ لیکن.......... لیکن تارا! میں برائی کی بڑی بڑی جڑوں میں سے ایک جڑ کو تو نشانِ عبرت بنا سکتا ہوں.......... میں مشہور فلم اسٹار' ہدایت کار اور فلمساز ارمان کو اپنے ساتھ قبر میں تو لے جا سکتا ہوں.......... میں لے جا سکتا ہوں نا؟" اس کی آنکھوں میں وحشت کی چمک تھی۔

تارا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ حیرت سے گم صم بیٹھی تھی۔

اشرف کو تارا کی کیفیت کا کچھ علم نہیں تھا وہ تو اپنا اندر تارا کے سامنے بیان کر رہا تھا۔ "ارمان کو مارنا میرے لئے مشکل نہیں تھا مگر وہ مر کر اور بڑی ہیروئن بن جاتی جبکہ میں اسے عبرت کا نشان بنانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا لوگ اس سے اور اس کے ذریعے پھیلنے والے مرض سے نفرت کریں۔ میں گزشتہ رات اس کے گھر گیا اور اپنا ایڈز اسے بھی دے آیا۔ اب وہ بھی مرے گی۔ مجھ سے کچھ عرصے بعد مرے گی مگر اس کی موت خاموشی کی موت نہیں ہوگی۔ ایک اذیت ناک موت ہو گی۔ لوگ اس سے دور بھاگیں گے کوئی اس

کے قریب جانا پسند نہیں کرے گا۔ ہاں تارا اب وہ مرے گی۔" یہ کہتے ہوئے اشرف کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے چمک ابھری مگر پھر دوبارہ پژمردگی چھا گئی۔ "اور تارا! یہی وہ وجہ تھی کہ جس کے باعث میں تم سے گریزاں تھا اور آئندہ بھی رہوں گا۔ میرا شباب گہنا چکا ہے۔ میں بوڑھے شباب کی جیتی جاگتی تصویر ہوں اور تم سے التجا کرتا ہوں کہ میرے ساتھ رہ کر اپنی زندگی کو برباد نہیں کرو۔ مجھے چھوڑ دو۔ تم نے محبت میں بہت بڑی قربانی دی ہے۔ اب میں تم سے کوئی اور قربانی نہیں مانگ سکتا۔ خدا کے لئے تارا مجھے چھوڑ دو۔" وہ سر جھکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

تارا گم صم تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ بہت دیر اسی طرح بیٹھی رہی پھر اشرف کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔ "تم نے اپنے مجرم کو سزا دے دی۔ اب میں اپنی محبت کا خیال رکھوں گی۔ میں تمہاری محبت ہوں' تمہاری بیوی ہوں' تمہارے اور اپنے آخری سانس تک تمہارا ساتھ دوں گی' میں تمہاری بیوی ہو۔ میں تمہاری بیماری کو تو ختم نہیں کر سکتی مگر میں اس کی اذیت کو کم تو کر سکتی ہوں۔ تم نہیں جانتے اشرف جب عورت کسی سے ایک بار محبت کر لے تو پھر وہی اس کے لئے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ میں نے تم سے محبت کی ہے اور کرتی رہوں گی۔" وہ ایک عزم سے بول رہی تھی اور اشرف بہتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا' دیکھے جا رہا تھا۔

☆========== ختم شد ==========☆